ISSN 0974-7346

مئی ۲۰۲۵ء

جلد ۲۱۲ — عدد ۵

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کو CSR کی منظوری مل گئی ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ ذی قعدہ ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۵ء | عدد ۵

مجلس ادارت

پروفیسر شریف حسین قاسمی
دہلی

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
علی گڑھ

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
دہلی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲
مقالات		
المستخلص: قرآن مجید کا ایک قدیم فارسی لغت	عارف نوشاہی	۵
شاعر مشرق محمد اقبال: جدید اسلامی معاشیات کے میر کارواں	پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی	۲۰
ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعۂ قرآن	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۲۹
غلام رسول مہر بحیثیت ناقد غالب: ایک تنقیدی مطالعہ	اسعد اللہ	۳۸
مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ بحیثیت فارسی شاعر	ڈاکٹر امیر عباس خان عامر	۴۶
خطباتِ سرسید کی بازیافت نو	نعمان بدر فلاحی	۵۳
وقف کے نئے قانون کے بعد ہمارا لائحۂ عمل	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۵۸
وفیات		
آہ! خورشیدِ فکر و عمل غروب ہو گیا مولانا عبدالجواد اصلاحی مرحوم	کلیم صفات اصلاحی	۶۱
باب التقریظ والانتقاد		
الحل المدلل علی الدارمی من النصف الاول	محمد عمیر الصدیق ندوی	۶۵
تبصرۂ کتب	ظ۔ا۔خ، ع۔ص، ک۔ص۔اصلاحی	۷۱
ادبیات		
نظم (فرشتے لینے آئے ہیں)	خالد ندیم	۷۸
معارف کی ڈاک	خالد ندیم، توران رمیزانی	۷۹
رسید کتب موصولہ		۸۰

شذرات

مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے کئی سال پہلے معارف کے شذرات میں قلم کی شرافت اور زبان کی صداقت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ "مرکزی حکومت کی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہونے کے سبب ایسے امور کا ایک سلسلہ ہے جن کی زد مسلمانوں کے اسلامی اور ملی تشخص پر پڑتی ہے"۔ اس وقت لکھنے والے کے قلم کو کیا خبر تھی کہ دو سال بعد یعنی ۲۰۱۴ء میں حکومت واقتدار کا انقلاب، اس جملے یا احساس کو یوں بدل دے گا کہ مرکزی حکومت کی سطح پر مسلمانوں ہی کے مسائل سے دلچسپی ہونے اور رکھنے کے سبب ایسے امور کا وہ سلسلہ شروع ہو گا جو مسلمانوں کے ملی اور اسلامی تشخص پر زد اور ضرب ہی نہیں، زور اور زبردستی کے رویوں کو لامتناہی بنادے گا۔ ۲۰۱۴ء سے شروع ہونے والے دور نے ایک عشرہ کی مدت اس طرح پوری کی کہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی آبادی کا امتیاز رکھنے والے ملک کو ہر روز کسی نئے مسئلے کا سامنا صرف ایک اقلیت کے حوالے سے کرنا پڑا۔ خود اس بے چاری اقلیت کو بھی یہ یاد رکھنا مشکل ہو گیا کہ شام کا ستم، صبح کی نئی افتاد میں کیسے بدل جاتا ہے، مسجد، مدرسہ، درگاہ، زمین، جائداد، تجارت، تعلیم، تہذیب، ثقافت، زبان، لباس، غذا، مشروب، وضع قطع، تہوار، کھیل، تماشے، کسانی، مزدوری یعنی زندگی کی تمام علامتوں کے ساتھ عہد ماضی کی بوسیدہ اور مدفون یادوں اور راکھ کے ڈھیر میں چنگاریوں کو کریدنے کا عمل یہی بتاتا رہا کہ وہ دن گئے جب گلہ مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہونے کا تھا، اب تو ہندوستان کو جنت نشان بنانے والے صدیوں پہلے کے حکمرانوں کی قبروں کا وجود بھی ملک کا سب سے اہم مسئلہ بنادیا گیا کہ ساری دلچسپی بلکہ ساری مغزماری، تاریخ کے صفحات میں نفرت وانتقام کی تلاش کے لیے وقف ہو گئی۔

***

اس تلاش میں وقف کے مذہبی وجود اور اس کی ایک انتظامی اکائی کے لیے نفرت کی نظروں کا پانی مرنے کے اظہار سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ یعنی ملی مسائل کی فہرست میں اورنگ زیب، اردو، کٹھ ملا، روح افزا جیسی چنگاریوں کو ہوا دینے کے ساتھ سر فہرست وقف ترمیمی بل کے نام سے وہ ہنگامہ تھا، جو پارلیمنٹ سے ذرائع ابلاغ تک اور احتجاجوں سے قانون کے درودیوار تک بپا رہا اور ہے۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ مستکبرین اور مستضعفین کی یہ رزمیہ داستان کب اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک طرف تو یہ "طنطنہ" ہے کہ جب پارلیمنٹ نے ترمیمی بل کو منظور کر لیا تو اس قانون کو ہر حال میں ماننا ہی پڑے گا۔ دوسری طرف قانون اور عدالت کے ذریعہ فیصلہ کرنے والوں کے

چند سوالوں کے سامنے یہی طنطنہ اور یہی دبدبہ، خبروں کی زبان میں "سماعت کے طریقہ کار سے خوف میں بدل گیا" ایک سوال تو یہی تھا کہ قدیم مذہبی عبادت گاہوں کے دستاویزات کہاں سے آئیں گے؟ افہام وتفہیم کا اسلوب ظاہر ہے اتنا معقول تھا کہ جواب میں کہیں سے لکنت کی گنجائش نہیں تھی کہ وقف ایک مذہبی معاملہ ہے، اسلام کی روح سے وابستہ ہے۔ یہ ترمیمی بل غیر آئینی اور مسلمانوں کے مذہبی امور میں سراسر مداخلت ہے۔ دیگر طبقات کے مذہبی اداروں میں مسلمانوں کی شرکت نہیں تو پھر ان کے اداروں میں غیر مسلم کی موجودگی کیوں؟ اور کلکٹر کو جج ہونے کا حق کس رو سے مل سکتا ہے؟

نہیں معلوم کہ اس قضیہ کا فیصلہ کیا ہوگا، اقلیت کی قیادت، عدلیہ سے انصاف کی امید کے سوا کیا کر سکتی ہے؟ یہ امید انصاف کے حصول کے لیے کتنی ضروری ہے؟ اب وقت آگیا ہے کہ اقلیتی قیادت اس کے لیے اس طریق کار کی جستجو کے لیے وقف ہو جس سے مظلوم کو انصاف ملے اور ظالم کو ہمیشہ کے لیے اپنے ظلموں کے سمندر میں غرق ہونے کی سزا بھی مل سکے۔ اس کے لیے قومی اعمال نامہ پر بھی دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ملی قیادت کے نام پر سیاسی بے شعوری اور مستقبل کے خطرات کی سنگینی سے بے خبری اس اعمال نامہ میں سب سے بڑی کوتاہی بلکہ گناہ کی جانب اشارہ کرتی نظر آئے گی۔

***

سوا سو سال پہلے علامہ شبلی نے وقف کے ایک قضیہ پر حکومت کے ایک فیصلہ پر سب سے پہلے خبر لی تھی کہ "اس فیصلے کے بعد سرکاری طور سے اس قسم کے تمام اوقاف باطل ہو گئے اور یہ نقصان عالم گیر ہوتا جاتا ہے"۔ لیکن اس وقت علامہ شبلی کو یقین تھا کہ گورنمنٹ کسی کے مذہبی احکام میں مداخلت نہیں کرتی اس لیے انہوں نے تمام ممکنہ پہلوؤں پر رائے مشورے کے بعد لکھا کہ ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ تمام ہند میں مجلس کریں، عرض داشت تیار کریں اور قانون بدلنے کے لیے حکام سے سلسلہ جنبانی کریں۔ ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے اور ہندوستان کی تمام مقتدر مجالس سے اس میں مدد لی جائے۔ علامہ شبلی کی بہت سی ناتمام خواہشوں کی طرح یہ تمنا بس حسرت بن کر رہ گئی۔ شبلی والا شعور زندہ و بیدار ہوتا تو شاید ایسے شعر زبان پر نہ آتے کہ:

فریب روشنی میں آنے والو، میں نہ کہتا تھا
کہ بجلی آشیانے کی نگہباں ہو نہیں سکتی

***

علامہ شبلی کی یاد اصلاً کھوئے ہوؤں کی آرزو ہے۔ اسی آرزو کا ایک جدید ترین اظہار دارالمصنفین کے سابق ناظم اور معارف کی مجلس ادارت کے رکن پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی نئی

کتاب ''شبلی شناسی کی نئی جہات — علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے '' ہے۔ نام سے ظاہر ہے کہ علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت میں چند نئی جہات کی دریافت، مطالعات شبلی میں اضافہ ہے، ساتھ ہی شبلی، سرسید اور تحریک علی گڑھ کے موضوع پر ایک بنیادی ماخذ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی مدد سے بعض اہم اور نئے معلومات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ فاضل مصنف کی نظر میں شبلی، سرسید تعلقات کے مطالعہ میں گزٹ کا استعمال کم ہوا، بقول مصنف ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ علامہ شبلی کی علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں ایک خزانہ موجود ہے۔ یہ تحقیق اور پیش کش ان کے خیال میں علی گڑھ اور اعظم گڑھ کے بیچ پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنے کی کوشش ہے اور یہ احساس بھی تلخ تر ہوتا ہے کہ علی گڑھ کو علامہ شبلی ندوے کے لیے چھوڑ کے آئے تھے لیکن ندوے نے ان کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ شبلی کے ساتھ مقدمہ میں گزٹ کا مختصر لیکن نہایت مفید و وقیع تعارف ہے جس سے عام طور پر واقفیت نہیں۔ گزٹ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ تعارف یقیناً ناگزیر ہے۔ یہ کتاب مفصل مطالعہ و جائزہ کی طالب ہے۔ یہاں ایک قیمتی کتاب کو وجود میں لانے کے لیے اور خزینۂ شبلیات میں بیش بہا اضافہ کرنے کے لیے یہ چند سطریں بطور تہنیت و تحسین و تعارف صریر خامہ سے ہم آہنگ ہوگئیں۔

***

گزشتہ دنوں پروفیسر زین الساجدین میرٹھی اور جناب عابد رضا بیدار کی رحلت کی خبریں علمی دنیا کو اداس کرگئیں ۔ میرٹھ کے ایک علمی خانوادہ اور مشہور عالم و مصنف قاضی زین العابدین کے صاحبزادے قاضی زین الساجدین مسلم یونیورسٹی کے ایک لائق استاد ہی نہیں، شرافت نسبی و علمی کی تصویر بھی تھے۔ مہمان نوازی کی صفت بھی بڑی دلنواز تھی۔ چہرہ معصومیت کا آئینہ تھا۔ عابد رضا بیدار مرحوم بجائے خود ایک جہان علم و عمل تھے جس کے لیے ایک جامع مضمون چاہیے، ان کے جانے کا غم تازہ ہی تھا کہ ایک اور صاحب فضل و کمال پروفیسر خورشید احمد کی وفات کی خبر آگئی۔ تحریک اسلامی سے مضبوط وابستگی نے ان کے قلم کو وہ تاثیر بخشی جس نے اسلام کو درپیش جدید مسائل کی تشریح و تفسیر کو ہر طبقہ میں مقبول بنادیا۔ ترجمان القرآن کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اس کے اداریوں کو اردو کی اعلیٰ صحافت کے ناقابل فراموش کردار میں بدل دیا۔ اعتدال و توازن ان کی شخصیت اور تحریر دونوں کو امتیازی شان اور شناخت عطا کرتے رہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

***

ایک خوش کن خبر البتہ یہ ہے کہ شبلی اکیڈمی کی نئی ویب سائٹ ناظم دارالمصنفین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کی بڑی محنت سے از سر نو تیار ہو گئی ہے، پتہ وہی ہے۔ https://shibliacademy.org

***

المُستخلَص: قرآن مجید کا ایک قدیم فارسی لُغت

عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

(I)

راقم السطور پہلی بار ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۱ء کتب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد سے وابستہ رہا۔ وہاں میرا کام کتب خانے کے لیے حاصل کئے گئے مخطوطات کو نمبر لگانا اور ان کے جملہ کوائف ایک مخصوص رجسٹر میں ثبت کرنا تھا۔ چنانچہ ایک مخطوطے پر نمبر ۲۰۷ لگایا، رجسٹر پر اس کا نام "مجموعہ: لغات قرآن و تجوید قرآن" لکھا، کاتب کے نام اور تاریخ کتابت (۷۲۲ھ و ۷۲۷ھ) کا اندراج کیا [۱]۔ ناقص الاوّل ہونے کی وجہ سے، اندراج کے وقت راقم کو نسخے کا نام اور مصنف کا علم تو نہ ہو سکا، لیکن میں نے اس کی اہمیت اور قدامت کو بھانپ لیا۔ بعد میں مزید تحقیق سے کتاب اور مصنف کا نام معلوم ہو گیا اور اس کے تعارف پر میں نے ایک چھوٹا سا مضمون اردو میں سپرد قلم کیا جو انھی ایام میں شائع ہو گیا۔ بعد میں اس کتاب اور مصنف کے حوالے سے مزید کچھ مضامین اور انتقادات فارسی میں لکھے [۲]۔ اب کئی سالوں بعد ان سب مضامین پر نظر ثانی کا موقع

---

[۱] محمد حسین تسبیحی، فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانہ گنج بخش، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء، جلد ۳، ص ۵۷۳-۵۷۵، 'ناشناختہ در لغات قرآن'؛ احمد منزوی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانہ گنج بخش، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ج ۳، ص ۱۰۲۳-۱۰۲۴ 'ترجمان القرآن'۔

[۲] عارف نوشاہی، "المستخلص کا پاکستان میں قدیم ترین مخطوطہ"، المعارف، لاہور، جلد ۱۵، شمارہ ۶، شعبان ۱۴۰۲ھ / جون ۱۹۸۲، ص ۲۳-۲۸؛ مکرر اشاعت: عارف نوشاہی، "قرآن کی لغات المستخلص کا قدیم ترین مخطوطہ"، قرآن الہدی، کراچی، اپریل ۱۹۸۲، ص ۲۶-۲۷؛ عارف نوشاہی، "بخاری، محمد بن محمد"، دانشنامۂ جہان اسلام، تہران، ۱۳۷۵ش / ۱۹۹۷ء، ج ۲، ص ۳۸۶؛ عارف نوشاہی، "المستخلص"، دانش، اسلام آباد، شمارۂ ۱۰، تابستان

ملا ہے۔اس عرصے میں کتاب اور مصنف کے بارے میں چند نئی معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔ نئی اور پرانی معلومات کو یکجا کر کے اب بالکل ایک نئے مضمون کی شکل دی ہے جو پیش خدمت ہے۔

(II)

قدیم ترین اسلامی کتابیں قرآنی علوم اور مسائل یعنی اختلاف مصاحف، محکم و متشابہ، قراءات، بیان لغات الفاظ، وقف و ابتدا وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔ ابن ندیم (۲۹۷-۳۸۵ھ / ۹۱۰-۹۹۵ء) نے کتاب الفہرست کے فن دوم کے مقالۂ اوّل میں قرآن مجید کی لفظی مشکلات کے حل پر مبنی (عربی) کتب کا ذکر تین عنوانات کے تحت کیا ہے:

۱) قرآن کے معانی، مشکلات اور مجاز کے موضوع سے متعلق تصنیفات (چوبیس تصانیف)۔
۲) غریب القرآن کے سلسلے کی تصنیفات (چودہ مصنفین)۔
۳) لغات قرآن کے بارے میں تصنیفات (چھ مصنفین)[۳]۔

حاجی خلیفہ (۱۰۰۴-۱۰۶۷ھ / ۱۵۹۶-۱۶۵۷ء) نے کشف الظنون میں 'علم غریب الحدیث و القرآن' اور 'علم مفردات القرآن' عنوانات کے تحت اسی موضوع پر مزید عربی کتب کا ذکر کیا ہے[۴]۔

اس وقت ہمارا موضوع فارسی زبان میں لکھے گئے قرآن مجید کے لغات ہیں۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں، بارہویں صدی عیسوی میں اس قسم کے لغات کی تدوین چار نہج پر ہوئی[۵]۔

۱۳۶۶ش / ۱۹۸۷، ص ۱۳۳-۱۳۸؛ مکرر اشاعت: عارف نوشاہی، "المستخلص و جواہر القرآن"، ناموارۂ دکتر محمود افشار، گردآورندہ ایرج افشار، با ہمکاری محمد رسول دریاگشت، بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، تہران، ۱۳۷۷ش / ۱۹۹۸ء، جلد ۱۰، ص ۵۸۳۹-۵۸۴۲۔

(۳) ابو الفرج محمد بن ابی یعقوب اسحاق المعروف بالورّاق: کتاب الفہرست للندیم، تحقیق: رضا تجدّد، مقام اشاعت، ناشر، تاریخ درج نہیں، ص ۳۷-۴۱؛ ایضاً، کتاب الفہرست، تحقیق و تعلیق: ایمن فواد سید، لندن، مؤسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی، ۲۰۰۹ء، ص ۹۰-۹۸۔

(۴) حاجی خلیفہ، مصطفٰی بن عبد اللہ: کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون، تحقیق اکمل الدین احسان اوغلی و بشار عواد معروف، لندن، مؤسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی، ۲۰۲۱ء، ج ۵، ص ۹۷-۱۰۹؛ جلد ۷، ص ۱۶۔

(۵) علی نقی منزوی: فرہنگ نامہ ہای عربی بفارسی، تہران، ۱۹۵۹ء، ص: ۱۶-۱۸۔

۱. اقسامِ کلمات (اسم، فعل وغیرہ) کی ترتیب پر۔ اس سلسلے کی قدیم ترین کتاب ترجمان القرآن از ابوعبداللہ حسین بن احمد بن حسین زوزنی (م ۴۸۶ھ / ۱۰۹۳ء) ہے[۶]۔

۲. قرآن مجید کی سورتوں کی اُلٹی ترتیب پر سورۃ الناس سے سورۃ البقرۃ تک۔ یہ ترتیب چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں تصنیف شدہ ابوالمعالی احمد بن محمد الغزنوی کی کتاب تراجم الاعاجم اور اس کی تقلید میں لکھی گئی دوسری کتابوں میں پائی جاتی ہے[۷]۔

۳. قرآن مجید کی سورتوں کی سیدھی ترتیب یعنی سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ سے سورۃ الناس تک۔ یہ ترتیب ہمیں چوتھی یا پانچویں صدی ہجری کے ایک نامعلوم مصنف کی لسان التنزیل (مشمولہ مقدمۂ تراجم الاعاجم) اور المستخلص (زیر بحث) میں ملتی ہے[۸]۔

۴. حروف تہجی کی ترتیب پر۔ حبیش بن ابراہیم بن محمد تفلیسی (م تقریباً ۶۰۰ھ / ۱۲۰۲ء) نے اپنی کتابیں جوامع البیان اور وجوہ القرآن اسی ترتیب کے مطابق لکھی ہیں[۹]۔

(III)

المستخلص کے مصنف: اس وقت ہمارے زیر بحث کتاب المستخلص ہے۔ اس کے مصنف کا نام ابوالفضل (یا ابوالعفۃ) حافظ الدین کبیر محمد بن محمد بن نصر بخاری ہے۔ ذہبی نے نسب میں نصر ابن القلانسی البخاری اور معین الفقرا نے نصر بن محمد بن ابی بکر القلانسی البخاری لکھا ہے[۱۰]۔ وہ تقریباً

---

(۶) عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین، دمشق ۱۹۵۷ء، ج ۳، ص ۳۰۹؛ منزوی، حوالۂ مذکور۔

(۷) ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: منزوی، حوالۂ مذکور، ص ۶۱-۶۴؛ محمد علوی مقدم اور رضا اشرف زادہ نے المستخلص فی ترجمان القرآن کے مقدمے (ص دو) میں تراجم الاعاجم کو زین المشائخ محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی متوفی ۵۶۲ھ کی تصنیف لکھا ہے۔

(۸) منزوی، حوالۂ مذکور، ص ۱۵۲- ۱۵۴۔

(۹) منزوی، حوالۂ مذکور، ص ۶۵-۸۱؛ کحالہ، حوالۂ مذکور، ۳: ۱۸۹۔

(۱۰) ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی، تاریخ الاسلام و وفیات المشاہیر والاعلام، تحقیق بشار عواد معروف، دارالغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء، ج ۱۵، ص ۶۳۷؛ احمد بن محمود مدعو بہ معین الفقرا، تاریخ ملازادہ در ذکر مزارات بخارا، بہ اہتمام احمد گلچین معانی، تہران، کتابخانہ ابن سینا، ۱۳۳۹ش / ۱۹۶۴ء، ص ۵۵۔

۶۱۵ھ / ۱۲۱۸ء میں بخارا میں پیدا ہوئے اور ۱۸ شعبان ۶۹۳ھ / ۲۱ جولائی ۱۲۹۴ء کو وفات پائی[11]۔ ان کی قبر بخارا کے نزدیک کلاباذ میں اپنے والد کی قبر کے بالکل ساتھ اور امام ابو بکر بن طرخان (م: صفر ۳۳۳ھ / ۹۴۴ء) کے مقبرے کے جوار میں ہے۔ قدیم زمانے میں اس جگہ کو تل بُغرا بیگ (بُغرا بیگ کا ٹیلہ) یا تَل میانہ (وسطی ٹیلہ) کہتے تھے۔ بعد میں نویں صدی ہجری کے اوائل میں ان مزارات کی وجہ سے اس جگہ کا نام تل خواجہ ابو بکر طرخان اور تل مولانا حافظ الدین پڑ گیا۔

مصنف کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ معین الفقرا نے اس گھرانے کے لوگوں کے نام بہت عزّت اور احترام سے لکھے ہیں۔ جیسے مصنف کے والد کا پورا نام: الامام علاء الدین محمد بن نصر بن محمد بن ابی بکر القلانسی البخاری (م: ۱۳ ربیع الاول ۶۳۱ھ / ۲۴ دسمبر ۱۲۳۳ء)، داماد کا نام: ابو عبد اللہ محمد بن محمد بن محمد المصدّر البخاری ملقب بہ الامام الہمام مقتدی الانام مولانا تاج الدین المصدّر (م: غرّۂ رمضان ۷۱۰ھ / ۲۹ یا ۳۰ جنوری ۱۳۱۱ء) اور نواسے کا نام: الامام الہمام مولانا حسام الدین (م: ۳ ربیع الآخر ۷۲۷ھ / ۶ مارچ ۱۳۲۷ء) لکھا ہے[12]۔ یہ مولانا حسام الدین خواجہ یوسف، خواجہ محمد پارسا بخاری (م: ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء) کے چچا تھے[13]۔

حافظ الدین کا شمار حنفی مذہب کے مفسّرین، محدّثین اور فقہا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے حدیث، فقہ، ادب اور دیگر علوم شمس الائمہ محمد بن عبد الستّار کردری (۵۹۹-۶۴۲ھ / ۱۲۰۳-۱۲۴۴ء) سے پڑھے۔ حدیث کی کتاب جامع الصغیر ابو الفضل عبید اللہ بن ابراہیم محبوبی (۵۴۶-۶۳۰ھ /

---

(۱۱) Storey, C.A., *Persian Literature: A bio-bibliographical survey*, London, 1939, Section II, Fasciculus 3, pp.31, 1215۔

(۱۲) معین الفقرا، تاریخ ملازادہ، ص ۵۵-۵۶۔

(۱۳) مبارک بن صلاح بخاری، انیس الطالبین وعدۃ السالکین، بہ تصحیح توفیق ہاشم پور سبحانی وخلیل ابراہیم صاری اوغلی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۸۳ش / ۲۰۰۴ء، طبع دوم، ص ۱۰۷؛ فخر الدین علی بن حسین واعظ کاشفی، رشحات عین الحیات، بہ تصحیح عارف نوشاہی، بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، تہران، ۲۰۲۴ء، ص ۲۳۷ صاحبِ رشحات نے خواجہ محمود انجیر فغنوی (م: ۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء) کے حالات کے ضمن میں 'مولانا حافظ الدین از کبار علمائے وقت کہ جدّ اعلای خواجہ محمد پارسا اند' لکھ کر ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد شمس الائمہ حلوائی کے کہنے پر خواجہ محمود سے سوال کیا کہ آپ ذکر جہر کس نیّت سے کرتے ہیں؟

۱۱۵۱-۱۲۳۳ء) کے سامنے پڑھی۔ اس وقت حافظ الدین کی عمر پندرہ سال تھی۔ وہ روایت حدیث میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان سے حدیث کی روایت کی سند کو عمدہ قرار دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ان سے حدیث سماعت اور روایت کی ہے ان میں ابوالعلا بخاری بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے معجم شیوخ میں استاد کے تذکرے میں انھیں بڑے عمدہ القاب: ''إماماً، عالماً ربانیاً، زاھداً، عابداً، فقیھاً، مدرساً، فاضلاً، کاملاً، محدثاً، مفسراً، مدققاً، جامعاً لأنواع العلوم'' سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ بخارا میں ان کی وفات سال ۶۹۳ کے شعبان کے نصف ثانی میں ہوئی اور کلاباذ میں دفن ہوئے۔ ان کے دیگر شاگردوں میں: حسام الدین حسین سغناقی، احمد بن اسعد خریفغنی، عبدالعزیز بن احمد بخاری، محمود بن محمد بخاری اور شمس الدین محمود کلاباذی فرضی شامل ہیں۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی (۹۵۸-۱۰۵۲ھ / ۱۵۵۱-۱۶۴۲ء) کو اپنے استاد شیخ علی بن حسام الدین متقی برہانپوری (۸۵۵-۹۷۵ھ / ۱۴۵۱-۱۵۶۷ء) سے برہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی (م: ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۷ء) کی کتاب الہدایہ کی روایت کی جو اجازت ملی تھی اس کے سلسلۂ رواۃ میں حافظ الدین محمد بن محمد نصر کا نام شامل ہے[۱۴]۔

(IV)

المستخلص: المستخلص بہت اہم کتاب ہے، جس میں قرآنی لغات کے معانی بیان ہوئے ہیں۔ ترتیب قرآنی سورتوں کے مطابق قائم کی ہے اور ہر سورے میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں انھیں ہجائی ترتیب کی بجائے، سورے میں وارد ترتیب سے درج کیا ہے۔ الفاظ کے معانی بیان کرتے ہوئے مصنف نے کئی ادبی، نحوی اور صرفی نکتے پیش نظر رکھے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سورتوں کے نام کی وجہ تسمیہ، آیات کی تعداد، الفاظ کا اشتقاق بتاتے ہیں اور عبارات کی تفسیر اور دوسروں کے اقوال

---

[۱۴] ابو محمد عبدالقادر بن محمد بن محمد بن نصر اللہ ابن سالم بن ابی الوفاء القرشی الحنفی، الجواھر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، تحقیق عبدالفتاح محمد بن الحلو، ہجر، جیزہ (مصر)، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء، ج۳، ص ۳۳۷؛ عبدالحق محدث دہلوی، ذکر اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث، بتحقیق ابوالبرکات حق النبی السندی الازہری، دارالفتح، عمان، ۱۴۳۹ھ / ۲۰۱۸ء ص ۱۴۵-۱۴۶؛ عبدالحیی لکھنوی، الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ، بہ اعتنا احمد الزعبی، شرکہ دار الارقم بن ابی الارقم، بیروت، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء ص ۳۲۵-۳۲۶۔

بھی نقل کرتے ہیں۔المستخلص کو ہم قرآن مجید کی فارسی زبان میں ایک مختصر لغوی تفسیر کہہ سکتے ہیں جس میں قدیم فارسی الفاظ اور تعبیرات کا ذخیرہ جمع ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ مشکل عربی الفاظ کا آسان اور سلیس فارسی میں ترجمہ کیا جائے اور بعض عربی قرآنی الفاظ کا فارسی معادل درج کیا جائے۔

کتاب کے متن میں نہ تو کہیں مصنف کا نام آیا ہے اور نہ ہی کتاب کا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر فہرست نویسوں نے اپنی فہارس مخطوطات میں کتاب کو محض لغات القرآن = لغات قرآن نام سے یاد کیا ہے۔ کتاب کا نام المستخلص فی ترجمان القرآن اور اس کا مصنف حافظ الدین محمد بن محمد بن نصر بخاری ہونے کا ذکر ایا صوفیہ نسخہ ۴۶۶۴ کے آخر میں کتاب کی قراءت سے متعلق یادداشت میں آیا ہے۔ اس نسخے کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

کتاب کا آغاز، وسط، انجام: آغاز: الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی علی الخصوص والخلوص علی محمدٍ عبدہٖ ورسولہٖ المصطفی۔

العوذ والعیاذ: پناہ گرفتن بہ کسی یا بہ چیزی یابہ جائی۔اقسام اسم و فعل ثلاثی شش است: سالم ومضاعف ومثال واجوف وناقص ومھموز، باللہ: بہ خدای۔ حروفی کہ اسم راجرّ کنند ہفدہ است۔

سورۃ الفاتحہ: الحمد: ستودن وسپاس وستایش، بہ معنی اوّل اورامصدر خوانند وبہ معنی دوم الحاصل بالمصدر۔

سورۃ البقرۃ: الم: وباقی حروفِ ہجا در اول سورہا تاویل وی بر دو گونہ است؛ یکی عام ویکی خاص۔

سورہ بنی اسرائیل: الجوس والحوس۔ در سرای گشتن برای غارت۔

سورہ ناس: ستّ آیاتٍ۔ قولہ ملک الناس إلہ الناس عطف بیان لربّ الناس لأن إلہ الناس... إن الشیطان المُوَسوِس ضربان جنّی وإنسی فنعوذ باللہ ونعتصم بہ ونتوکل علیہ فانّہ کافی من توکّل علیہ وھو حسبنا ونعم الوکیل (۱۵)۔

المستخلص کی لسانی اہمیت: فارسی زبان کے لغوی، نحوی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے المستخلص کی اپنی اہمیت ہے۔اس میں فارسی کے قدیم الفاظ اور تلفظ کے نمونے ملتے ہیں۔ڈاکٹر محمد علوی

(۱۵) آغاز، وسط اور انجام کی تمام عبارتیں نسخۂ ایاصوفیہ ۴۶۶۴ سے منقول ہیں۔ دیگر نسخوں کے ساتھ جزوی اختلاف کا امکان موجود ہے۔

مقدّم اور ڈاکٹر رضا اشرف زادہ نے المستخلص کی اشاعت میں، جس کا ذکر آگے آئے گا، کتاب کے لغوی اور اسلوبیاتی پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ چند نکات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

۱- جمع حاضر کے صیغے میں حرف 'د' کو حرف 'ت' میں بدل دینا۔ جیسے:

اِذا قُمتُم: چون **خواہیت** کی **برخیزیت** (چون خواہید کہ برخیزید)۔

فِطرَۃ اللّٰہ: ملازم **باشیت** دین خدای را (ملازم باشید دین خدای را)۔

۲- حرف 'ژ' کا حرف 'ش' سے ابدال، جیسے: باژ گونہ کی جگہ باشگونہ:

القَلبُ: باز گردانیدن و باشگونہ کردن۔

۳- بعض کلمات کی قدیم صورت جن کا تلفظ اب بدل چکا ہے، جیسے موجودہ سُم کی جگہ قدیم سُنب:

الظُفُر: ہر با سُنبی از ستوران۔

۴- الف مضموم (اُ) کا ندائیہ اور سوالیہ کے طور پر استعمال:

یٰس: اُسیّد (یعنی اے سیّد)۔

اَھکَذا: اُ ہمچنین است (یعنی آیا ہمچنین است؟)۔

عربی- فارسی لغات کے چند نمونے: مصنف نے حروف مقطعات کی تشریح کی ہے، جیسے حم عسق کے سامنے "سوگند بہ حلم و مجد و علم وسنا و قدرت من" لکھا ہے۔

الابریق: آب دستان

الآخر: باز پسین

الازفاف: شتابانیدن

الاسکان: آرامانیدن

اولوالامر: علما و فقہا و وُلات

البغضاء: دشمنادگی

التفہیم: دریابانیدن

الشاعر: قافیہ گوی

الصبر: شکیبائی کردن

الصیصیہ: اند خسوادہ

العرش: چفتہ وبنا کردن از چوب

العنکبوت: غندہ تنندہ

العنید: ستیزہ کَش

الغرفہ: بروارہ

الفضل: افزونی ونیکوئی

القسطاس: کپان

المکاء: شخولیدن

الوسطیٰ: میانہ گین یعنی نماز دیگر

الوکیل: کارران ونگاہ بان(۱۶)

المستخلص کے اہم مخطوطات: "المستخلص" کے تاحال کئی مخطوطات معلوم ہو چکے ہیں۔ جن میں کچھ قدیم (آٹھویں صدی ہجری)، کچھ جدید اور کچھ بلا تاریخ ہیں۔ ہم نے یہاں بہ لحاظ قدامت چند اہم نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

۱- ایاصوفیہ، مکتوبہ ۷۱۰ھ

کتب خانہ ایاصوفیہ (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۴۶۶۴، چھوٹی تقطیع پر ایک مجموعہ ہے جس میں المستخلص کے ساتھ **شرح بائیہ ذوالرمۃ** بھی ہے۔ نسخہ خطِ تعلیق میں لکھا گیا ہے۔ کاتب نے حرف دال کو ذال کی طرح لکھا ہے جیسے ستوذن، بوذہ است، پاذشاہ، راہ نموذن، داذن، پسندیذن وغیرہ۔ عربی الفاظ سرخ خط کشیدہ ہیں، اعراب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نسخے پر حواشی موجود ہیں۔ ترقیمے میں کاتب کا نام: محمد بن عمر بن محمود بن محمد ترمذی معروف بہ حافظ اور تاریخ کتابت بروز بُدھ، ۱۸شوال ۷۱۰ھ (۱۸مارچ ۱۳۱۱ء) درج ہے۔ انھوں نے یہ نسخہ

(۱۶) لغات کے یہ تمام نمونے ڈاکٹر مہدی درخشان کی تدوین کردہ المستخلص سے لیے گیے ہیں۔

قطب الملۃ والدّین عماد الاسلام والمسلمین[۱۷] کے لیے کتابت کیا۔ ترقیمے کے بعد ایک اجازت نامہ درج ہے جس میں حسن بن محمد بن احمد الحسینی معروف بہ شمس نے لکھا ہے کہ عزّالدین عبدالخالق بن شیخ اختیارالدین اوحدی نے ترجمۂ قرآن میں یہ کتاب المستخلص مصنفہ حافظ الدین محمد بن محمد بن نصر بخاری میرے سامنے پڑھی اور میں نے انھیں اس کتاب کی قراءت کی اُس روایت کی اجازت دی جو خود میں نے مصنف سے حاصل کی تھی۔ یہ سطور بُدھ، ۱۳ محرّم ۷۱۱ھ (۹جون ۱۳۱۱ء) کو لکھی گئیں۔ اس اجازت نامے کا رسم الخط نسخے کے ترقیمے سے بالکل مختلف ہے اور کاتب نے حروف پر نقطے نہیں لگائے۔ اسے کسی قدیم نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ جدید نقل کی تاریخ کتابت ماہ ذی القعدہ ۷۵۷ھ (نومبر ۱۳۵۶ء) ہے۔ اس اجازت نامے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حسن بن محمد بن احمد الحسینی، جنھوں نے خود یہ کتاب، مصنف حافظ الدین بخاری کے سامنے پڑھی تھی، ان کے نام کے ساتھ ''خصہ اللہ بالرحمۃ و الرضوان وأسکنہ غرف الجنان'' لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حافظ الدین ۱۳ محرّم ۷۱۱ھ (۹جون ۱۳۱۱ء) سے پہلے وفات پا چکے تھے اور ان کی تاریخ وفات (۶۹۳ھ)، جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں، درست ہے۔

۲- گنج بخش، مکتوبہ ۷۲۲ھ

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد، کتب خانہ گنج بخش، شمارہ ۷۲۰، دو کتابوں کا مجموعہ ہے، جس میں پہلی کتاب المستخلص ہے جسے کاتب علی بن محمد بن محمد بن عمر اترازی سمرقندی نے یوم ترویہ (۸ذی الحجہ) ۷۲۲ھ (۲۶ دسمبر ۱۳۲۲ء) کو حافظ علاءالدین بن محمد بن حمیدالدین شاشی کے لیے کتابت کیا۔ مخطوطہ قدیم خط نسخ (نزدیک بہ ثلث) میں لکھا گیا ہے اور کاتب نے حروف مہملہ (دال، ص، ط) کے نیچے علامت اہمال کے طور پر نقطہ لگایا ہے[۱۸]۔
(ص ۱۰: الاحاط، گرد در آمدن، منصوبہ)

[۱۷] ڈاکٹر مہدی درخشان نے المستخلص پر اپنے مقدمہ، ص ۳۶، میں قوسین میں اس امیر کا نام محمد بن حمید بن [کذا] چاچی لکھا ہے، معلوم نہیں انھوں نے یہ نام کہاں سے لیا ہے؟

[۱۸] علوی مقدم و اشرف زادہ نے المستخلص فی ترجمان القرآن کے مقدمے (ص نوزدہ) میں نسخۂ گنج بخش کے رسم الخط پر تفصیلی بحث کی ہے۔

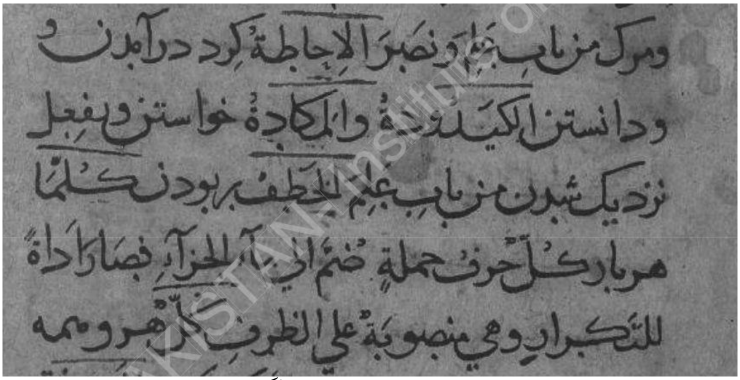

(تصویر علامت اہمال زیر حروف مہملہ، نسخہ گنج بخش، ۲۰ب)

یہ نسخہ ابتدا سے ایک ورق ناقص ہے اور ابتدائی چار ورق میں اوپر کی دو سطریں اور نیچے کی ایک سطر کرم خوردہ ہے۔ ورق دوم پر بسملہ کا لغت جاری ہے۔ اس کے بعد اسی ورق پر سورۂ فاتحہ کا لغت شروع ہو جاتا ہے۔ سورتوں کے نام سرخ روشنائی سے تحریر ہوئے ہیں اور عربی الفاظ خط کشیدہ ہیں۔ ۱۰۲ورق، ۱۳سطر، تقطیع ۱۸x۱۵سنٹی میٹر ہے۔ المستخلص کے بعد دوسرے رسالے کا کاتب: حسین بن حسن الصغناقی / الصفناقی اور تاریخ کتابت ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) ہے۔

۳- مجلس شورائے اسلامی، مکتوبہ ۷۲۷ھ

کتب خانہ مجلس شورائے اسلامی، تہران، شمارہ ۹۴۵۹، مجموعے میں تیسری کتاب المستخلص ہے۔ نسخے پر فہرست نگار نے اس کا نام لغات القرآن لکھا ہے۔ یہ مکمل نسخہ ہے اور کاتب: محمد بن محمد بن احمد الموفقالادکانی[۱۹] نے آخری عشرہ رمضان المبارک ۷۲۷ھ (اگست ۱۳۲۷ء)، بمقام نسا[۲۰] کتابت کیا ہے۔ خط واضح اور روشن ہے۔ سورتوں کے نام سرخ اور آیات کے الفاظ سرخ خط کشیدہ ہیں۔ اس مجموعے کے دوسرے دو رسالے اعراب القرآن ۱۰/رجب ۷۱۸ھ (۱۵ستمبر ۱۳۱۸ء) اور دیباج الاسماءاوائل جمادی الاوّل ۷۲۹ھ (مارچ ۱۳۲۹ء) میں کتابت ہوئے۔

---

(۱۹) نسخے میں دو جگہ پر الادکانی آیا ہے لیکن فہرست نگار نے اسے الاردکانی پڑھا ہے۔ دیکھیے: ابوالفضل حافظیان بابلی، فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ مجلس شورای اسلامی، کتابخانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران، ۱۳۸۸ش، ج۳۰، ص۱۴۶-۱۴۸؛ اردکان ایران کا شہر ہے۔

(۲۰) نسا، موجودہ ترکمنستان کا قدیم شہر جہاں سے امام نسائی کو نسبت ہے۔

۴- مرعشی، مکتوبہ ۷۳۳ھ

کتاب خانۂ آیت اللہ مرعشی نجفی، قُم، شمارہ ۱۳۸۹۶، کاتب: مراد بن شجاع الدین بن عبد اللہ الحافظ، ۷۳۳ھ (۳۳-۱۳۳۲ء)، مجموعے میں پہلی کتاب المستخلص ورق ۱ تا ۵۹ ہے، حاشیے پر تصحیحات اور حواشی موجود ہیں۔ پہلے یہ نسخہ آیت اللہ شیخ محمد حسن کاشانی ساکن بمبئی کی ملکیت میں تھا۔ پشت پر ان کا دستخط موجود ہے[۲۱]۔

۵- ایاصوفیہ، تقریباً ۷۴۰ھ

کتب خانہ ایا صوفیہ (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۴۸۳۷، مجموعۂ رسائل ہے، جس میں پہلی کتاب المستخلص، ورق ۱ تا ۴۳ ہے۔ المستخلص کی تاریخ کتابت نہیں ہے لیکن مجموعے کے دیگر رسائل کے آخر میں کاتب کا نام اور تاریخیں موجود ہیں جیسے نجم الدین کبری کا رسالہ "الی الھائم الخائف من لومۃ اللائم" بخط محمد بن ابراہیم الحافظ الاماسیوی[۲۲]، مکتوبہ یکم جمادی الاول ۷۴۱ھ (۱۲ نومبر ۱۳۳۹ء)؛ "نثر اللآلی" مکتوبہ ۱۱ ذی الحجہ ۷۴۰ھ (۱۶ جون ۱۳۴۰ء)؛ "کتاب الانبساط" بخط شیخ مسعود بن عثمان مکتوبہ ۷ محرم ۷۴۱ھ (۱۱ جولائی ۱۳۴۰ء)؛ "رسالہ امثلہ" بخط شیخ مسعود بن عثمان گلشہری[۲۳]، مکتوبہ ۵ محرم ۷۴۱ھ (۹ جولائی ۱۳۴۰ء) ہے۔ کاتب نے نسخے کے ظہر پر "کتاب المستخلص فی جواہر القرآن مِن تالیف ملک الافاضل فی عصرہ مُحَمَّد بن مُحَمَّد بن نصر المدعو بحافظ" اور کتاب کی تعریف میں دو سطریں فارسی میں لکھی ہیں۔

۶- ایاصوفیہ، مکتوبہ تقریباً ۷۷۲ھ

کتب خانہ ایا صوفیہ (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۴۶۲۶، مجموعے میں پہلی کتاب المستخلص ہے، نسخہ سورۃ الناس کے عنوان پر ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً اگلا ورق ضائع ہو چکا ہے جس پر سورہ کے الفاظ کی فرہنگ تھی۔ نسخے کی دوسری کتاب شرح قصیدۂ رائیہ ذوالرّمّہ کے آخر میں تاریخ

---

(۲۱) مصطفی درایتی، فہرستگان نسخہ ہای خطی ایران، سازمان اسناد و کتابخانہ ملی جمہوری اسلامی ایران، تہران، ۱۳۹۲ش/ ۲۰۱۳ء، ج۲۹، ص۴۱۵۔

(۲۲) ترکیہ کے شہر آماسیہ (Amasya) سے نسبت ہے۔

(۲۳) ترکیہ کے شہر گلشہر Gülşehir سے نسبت ہے۔

کتابت بروز جمعرات، ۵ شعبان ۷۷۲ھ (۲ مارچ ۱۳۷۱ء) درج ہے۔ دونوں کا ایک ہی کاتب ہے۔

۷- شہید علی پاشا، مکتوبہ ۸۳۶ھ

کتب خانہ شہید علی پاشا (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۳۲۴، کاتب: عثمان بن محمد بن عثمان لارندی، بمقام لارندہ[۲۴]، تاریخ کتابت: عشرۂ اوّل شعبان، ۸۳۶ھ (عشرۂ اول اپریل ۱۴۳۳ء)۔ نسخہ صاف، مکمّل، واضح خطِ نسخ میں ہے۔ کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں ہے۔ ترقیمے میں کتاب کا نام المستخلص فی تحقیق الفاظ القرآن اور مصنف کا نام شیخ امام المتبحر حافظ الدین الکبیر البخاری لکھا ہے یہی اسماء نسخے کے ظَہر پر بھی درج ہیں۔

۸- دانشکدۂ الہیات مشہد، مکتوبہ ۸۹۱ھ۔

دانشکدۂ الہیات و معارف اسلامی، دانشگاہ فردوسی مشہد، شمارہ ۴۱۶، تاریخ کتابت ۱۰ جمادی الآخر ۸۹۱ھ (۲۲ جون ۱۴۸۶ء)، پہلا ورق نہیں ہے۔ فہرست میں لغات القرآن نام سے درج ہوا ہے[۲۵]۔

۹- مرعشی، مکتوبہ ۹۲۶ھ۔

کتاب خانہ سید شہاب الدین مرعشی، قم، شمارہ ۴۵۰۷، یہ نسخہ احمد بن عبد الرحمان نے ربیع الثانی ۹۲۶ھ (اپریل ۱۵۲۰ء) میں کتابت کیا ہے[۲۶]۔

۱۰- قاضی زادہ محمود، بلا تاریخ۔

کتب خانہ قاضی زادہ محمود (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۵۴۰، مکمل نسخہ ہے لیکن بلا تاریخ ہے۔ کاتب نے صرف تمّ الکتاب لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ قیاساً آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کا ہے۔ خط نسخ، صاف، روشن اور سورتوں کے نام شنگرفی ہیں، ۱۱۳ ورق، بعض مقامات پر حاشیہ نویسی بھی ہے جو متن کی عبارتوں کی تکمیل کے لیے ہے۔

۱۱- فاتح، بلا تاریخ۔

کتب خانہ فاتح (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۶۴۵، مجموعے میں پہلی کتاب

---

[۲۴] لارندہ Laranda، جنوبی وسطی ترکیہ کا ایک قدیم شہر ہے۔

[۲۵] علوی مقدم و اشرف زادہ، مقدمہ المستخلص فی ترجمان القرآن، ص نُہ۔

[۲۶] احمد منزوی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، آر سی ڈی، تہران، ۱۳۵۰ش / ۱۹۷۱ء، ج ۳، ص ۲۰۲۶۔

المستخلص ورق ۱ تا ۹۶ ہے۔ کاتب نے نسخے کے ظَہر پر ”المستخلص للامام مفتی الجنّ و الانس حافظ الدین الکبیر البخاری نور اللہ مضجعہ“ لکھا ہے۔ نسخہ مکمل اور صاف خط نسخ میں ہے۔ ترقیمے میں تاریخ نہیں ہے۔ خط قدیم قیاساً نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کا ہے۔ حاشیے پر اضافات اور تصحیحات کی گئی ہیں۔ ظَہر پر دو پرانے دستخط مصطفی بن لطف اللہ اور محمد بن علی الفناری کے ہیں۔

۱۲- مراد بخاری، بلا تاریخ۔

کتاب خانہ مراد بخاری (مخزونہ سلیمانیہ لائبریری)، استنبول، شمارہ ۴۲، نسخے کے ظَہر پر مصنف کا نام القاب کے ساتھ ”العلامہ مقتدی الامّۃ البارع الورع عَلم الہدیٰ مفتی المسلمین امام الموحدین حافظ الدین الکبیر“ لکھا ہے۔ قدرے متاخر کتابت شدہ، ناقص الآخر نسخہ ہے۔ سورۃ الحاقّہ میں لفظ الاستیصال پر ختم ہو جاتا ہے۔ ۷۵ ورق۔

۱۳- عبد اللہ کشاورزی، بلا تاریخ۔

کتاب خانہ عبد اللہ کشاورزی، مشہد، بخط نسخ، مخطوطے سے کاتب کا نام اور سالِ کتابت کھرچ دیا گیا ہے۔ تاہم خط گیارہویں صدی ہجری (سولھویں۔ سترھویں صدی عیسوی) کا معلوم ہوتا ہے۔ نسخے کے آخر میں مالکیت کی ایک پرانی یادداشت میں سال ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) مرقوم ہے۔ یہ نسخہ سورۂ محمد سے سورہ الناس تک ہے۔ عنوانات سُرخ ہیں اور حاشیے پر وضاحتیں موجود ہیں۔ ۲۱۸ صفحہ، ۱۵ سطر، تقطیع ۲۰x۱۳۰ سنٹی میٹر ہے[۲۷]۔

المستخلص کی تلخیص: قاضی خان بدر محمد دہار (زندہ ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء) نے دستورالاخوان کے دیباچے میں خلاصۂ مستخلص نامی کتاب کو اپنے مآخذ میں شمار کیا ہے[۲۸]۔ جس کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ خلاصۂ مستخلص نام سے ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس (اب برٹش لائبریری

---

[۲۷] علی نقی منزوی، حوالۂ مذکور، ص ۱۵۴؛ احمد منزوی، حوالۂ مذکور، ج ۳، ص ۲۰۲۶۔

[۲۸] قاضی خان بدر محمد دہار، دستورالاخوان، بہ تصحیح سعید نجفی اسد اللہی، تہران، بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۴۹ش / ۱۹۷۰ء، ج ۱، ص ۲، کتاب کے مرتّب نے اپنے مقدمے میں خلاصۂ المستخلص کو کسی نامعلوم مصنف کی آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف بتایا ہے اور گمان ظاہر کیا ہے کہ قاضی خان بدر محمد کی خلاصۂ المستخلص سے مراد کتاب لسان التنزیل ہے (مقدمہ مصحح، ص ہفت)۔

لندن کا حصہ)، شمارہ ۵۰۴ میں موجود ہے جس کا مصنف معلوم نہیں ہے اور اس نے خود کو 'این فقیر ضعیف' لکھا ہے۔ اس خلاصۂ مستخلص میں قرآنی سورتوں کی لغات نویسی سورتوں کی معکوس ترتیب سے ہوئی ہے۔ المستخلص اور دستور الاخوان میں درج کئی لغات اور معانی میں مکمل شباہت پائی جاتی ہے[۲۹]۔

اشاعتیں: المستخلص کی اب تک تین مختلف اشاعتیں ہو چکی ہیں۔

- اشوال ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد سے کتب خانہ گنج بخش کے مخطوطہ نمبر ۲۰۷ کی عکسی (facsimile) اشاعت ہے۔ چونکہ اس مخطوطے میں قرآنی علوم سے متعلق دو کتابیں ہیں، اس اشاعت کا نام دو اثر در علوم قرآنی رکھا گیا اور سرورق پر المستخلص نام کا ذکر نہیں ہے۔ اس عکسی اشاعت پر مرکز کے اُس وقت کے ڈائریکٹر اکبر ثبوت نے پانچ صفحات کا ایک تعارفی پیش لفظ 'سخن مدیر' عنوان سے لکھا۔ یہ اشاعت ۳۷ ۳ صفحات پر مشتمل ہے جس میں المستخلص ص ا تا ۲۰۲ اور علوم قرآنی پر عربی رسالہ ص ۲۰۲ تا ۳۷ ۳ ہے۔
- ۱۳۶۵ش / ۱۹۸۶ء، بہ اہتمام ڈاکٹر مہدی درخشان[۳۰]، دانشگاہ تہران سے "المستخلص" یا "جواہر القرآن" عنوان سے شائع ہوئی۔ اس اشاعت میں نسخۂ ایاصوفیہ ۴۶۶۴ کو بنیاد اور نسخۂ گنج بخش کو متبادل کے طور پر رکھا گیا ہے۔ مرتّب نے نسخۂ ایاصوفیہ کی نسخۂ گنج بخش پر قدامت اور صحت پر کئی شواہد پیش کیے ہیں (مقدمہ، ص ۲۳-۲۷)۔ نسخۂ گنج بخش کے علاوہ اس اشاعت میں نسخۂ کشاورزی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مرتّب کو کتاب کے مصنف حافظ الدین کبیر بخاری کے حالات قطعاً معلوم نہیں ہو سکے (مقدمہ،

---

(۲۹) Ethe, Hermann, Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of India Office, Oxford,1903,No.2701

(۳۰) ڈاکٹر مہدی درخشان (۱۹۱۸-۱۹۹۳ء) تہران یونیورسٹی میں ادبیات فارسی کے استاد تھے۔ راقم السطور کے دوستوں میں سے تھے۔ جب المستخلص پر کام کر رہے تھے تو مجھ سے رابطہ قائم کیا اور میں نے انھیں المستخلص کے نسخۂ گنج بخش ۲۰۷ کے بارے میں مجلہ المعارف، لاہور میں شائع شدہ اپنا مقالہ بھیج دیا جس کا ذکر انھوں نے اپنے مقدمے، ص ۱۸ میں کیا ہے۔

ص ۴۱-۴۲)[۳۱]۔

- سرما ۱۳۶۵ش/ ۱۹۸۷ء، مرکز نشر فرہنگی رجا (تہران) کی طرف سے ڈاکٹر محمد علوی مقدّم[۳۲] اور رضا اشرف زادہ کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ "المستخلص فی ترجمان القرآن" عنوان سے اشاعت ہوئی۔ اس کی بنیاد نسخۂ گنج بخش (نمبر ۲۰۷) مکتوبہ ۷۲۲ھ ہے اور ایا صوفیہ مکتوبہ ۷۱۰ھ اور دانشکدۂ الہیات مشہد مکتوبہ ۸۹۱ھ کے نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

جواہر القرآن: ڈاکٹر مہدی درخشان نے اپنی اشاعت میں کتاب کا نام "المستخلص یا "جواہر القرآن" اور ڈاکٹر محمد علوی مقدم نے "المستخلص فی ترجمان القرآن" لکھا ہے۔ فارسی لغات قرآن پر ہم خلاصہ جواہر القرآن فی بیان معانی لغات القرآن تالیف ابو بکر اسحاق بن تاج الدین ابی الحسن الحافظ الملتانی کو جانتے ہیں جس کا سال تصنیف ۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخاری اور ملتانی کے پیش نظر کتاب لسان التنزیل تھی کیوں کہ دونوں مصنفین کی کتابوں میں الم کی تفسیر لفظ بہ لفظ وہی ہے جو لسان التنزیل میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بخاری اور ملتانی کی کتابوں کے مندرجات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن المستخلص اور خلاصہ جواہر القرآن میں درج قرآنی الفاظ کی تعداد کم و بیش ہے اور مختلف بھی۔ یہ اختلاف سورۂ بقرہ اور پارۂ عمّ میں بالکل واضح ہے۔ سورۂ بقرہ کے حوالے سے بخاری کے مقابلے میں ملتانی کی کتاب میں بہت کم الفاظ ہیں، جب کہ پارۂ عمّ کے حوالے سے ملتانی کی کتاب میں زیادہ الفاظ ہیں اور بخاری میں کم۔ دونوں کتب میں الفاظ کا تناسب ۲۶۹:۱۹۴ کا ہے۔ المستخلص اور خلاصہ میں ایک بنیادی فرق لغات کے اندراج کی ترتیب کا بھی ہے۔ المستخلص میں سورتوں کی سیدھی ترتیب ہے اور خلاصہ میں معکوس ترتیب ہے۔ خلاصہ جواہر القرآن دراصل کسی جواہر القرآن نامی کتاب کی تلخیص نہیں ہے بلکہ ملتانی کی اپنی ہی ایک تصنیف خلاصۃ الدین کی تلخیص ہے۔

---

(۳۱) راقم الحروف نے ڈاکٹر مہدی درخشان کی مرتبہ اشاعت پر ایک نقد بزبان فارسی لکھی تھی، دیکھیے: مجلہ دانش، اسلام آباد، شمارہ ۱۰، تابستان ۱۳۶۶ش/ ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۳-۱۳۸؛ اس نقد کے جواب کے لیے دیکھیے: مہدی درخشان، دانش، اسلام آباد، شمارہ ۱۳، بہار ۱۳۶۷ش/ ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۴-۱۳۸۔

(۳۲) ڈاکٹر محمد علوی مقدم (۱۹۳۲-۲۰۱۸ء) بھی راقم کے بزرگ احباب میں سے تھے۔ ۱۹۸۷ میں جب وہ ایران سے ایک سال کے لیے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں استادِ مدعو بن کر آئے تو ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔

شاعر مشرق محمد اقبال: جدید اسلامی معاشیات کے میر کارواں

پروفیسر عبد العظیم اصلاحی

aaislahi@hotmail.com

بیسویں صدی اپنے ماقبل کی صدیوں سے کئی لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے کہ اس میں بہت سے نئے علوم کا ارتقا ہوا۔ بہت سے نئے علمی و دینی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور بہت سی ایسی شخصیات نے جنم لیا جن کی مثال گذشتہ کئی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔ اس صدی میں جدید اسلامی معاشیات کا فروغ ہوا۔ معاشی تعلیمات تو اسلام کے بنیادی مآخذ میں موجود ہیں اور ان پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی اسلام کے نمایاں ادوار میں جاری رہا۔ ابو یوسف کی کتاب الخراج، ابو عبید القاسم بن سلام کی کتاب الأموال اس کی واضح مثالیں ہیں، لیکن پھر جو علمی اضمحلال طاری ہوا تو اور بہت سے علوم کی طرح معاشی مسائل پر کچھ سوچنے اور لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ اس کا دوبارہ آغاز گذشتہ صدی میں ہوا۔ اس کے نمایاں اسباب میں مغرب سے مادّی اقتصادیات کی درآمد اور اس وقت کے دو نمایاں نظام ہائے معیشت، سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کشمکش رہی ہے۔ اس چیز نے مسلم علماء و مفکرین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اسلام کا کوئی اپنا اقتصادی نظام بھی ہے یا وہ دو نظاموں کا دم چھلّہ بن کر رہے گا۔ مسلم علماء و مفکرین کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کرنے پر اسلام کے اپنے اقتصادی نظام کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس طرف رہنمائی کرنے میں علامہ اقبال کی شاعری نے اوّلین کردار ادا کیا۔

شیخ محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں لاہور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کے لیے ان کا تقرر ہو گیا جہاں ان کے ذمّے تاریخ اور معاشیات کی تدریس بھی تھی۔ بی۔ اے میں ان کے پاس فلسفہ، انگریزی اور عربی کے مضامین تھے۔ معاشیات کبھی پڑھی نہیں

تھی۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ معاشیات پر اس عہد کے مشہور انگریزی مصنفین کی کتابوں سے لکچر تیار کرکے پڑھاتے رہے اور بہت جلد اس طرح معاشیات میں ان کی اپنی کتاب علم الاقتصاد کے نام سے تیار ہوگئی[۱]۔ یہ بھی روایت ہے کہ پنجاب نصاب کمیٹی کی طرف سے اس طرح کی کتاب کی تیاری ان کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ امر واقع جو بھی ہو مگر علامہ اقبال کی یہ کتاب نہ صرف اردو میں بلکہ غالباً تمام مشرقی زبانوں میں معاشیات پر پہلی اصالۃً تحریر کردہ کتاب ہے اس لیے کہ عربی جیسی ترقی یافتہ زبان میں بھی اس وقت تک اصلاً لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں تھی۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں مصری مجلہ "الضیاء" کے ایک قاری نے اس کے ایڈیٹر شیخ ابراہیم الیازجی سے معاشیات پر عربی میں لکھی کتابوں (نہ کہ مترجم) کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے فاضل ایڈیٹر نے جواب دیا: "لم نعثر في ذلک علی کتاب عربي الأصل" (ہمیں اس طرح کی کوئی اوریجنل عربی کتاب نہیں ملی)[۲]۔ دیباچۂ کتاب میں علامہ اقبال نے واضح کردیا ہے کہ "یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے"[۳] بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ذاتی خیالات کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ کسی نئے مضمون میں اصطلاحات کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں علامہ نے بعض معاشی تصورات کا ترجمہ خود کیا ہے اور بعض کو عربی جرائد سے اخذ کیا ہے۔

اس کتاب کا محرک یہ جذبہ تھا کہ ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کو معاشیات کے علم سے روشناس کیا جائے تاکہ وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہوسکیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں

---

[۱] کتاب کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل مصنفین کی کتابیں ان کے سامنے رہی ہیں: ایڈم اسمتھ Adam Smith، ڈیوڈ ریکارڈو David Recardo، جان اسٹوارٹ مل John Stuart Mill، الفریڈ مارشل Alfred Marshal، ایف اے واکر FA. Walker، اور تھامس مالتھوس Thomas Malthus۔

[۲] مجلۃ الضیاء المصریۃ، ص: ۲۶۰۔

[۳] اقبال، محمد، علم الاقتصاد، مخزن ایجنسی لاہور، ۱۹۰۴ء، ص: ۴۔

چیکے چیکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں۔ ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے"[۴]۔ علم الاقتصاد کو علامہ نے انسان کے لیے نہایت دلچسپ مضمون قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق چونکہ اہل ہند میں مفلسی کی شکایت عام ہے اس لیے اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے[۵]۔

اقبال کی کتاب علم الاقتصاد پر سن طباعت نہیں درج ہے۔ اس کی اشاعت کے سلسلہ میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کی روایتیں ہیں مگر بعض ثبوتوں کی بنیاد پر اغلب رائے یہ ہے کہ کتاب ۱۹۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی[۶]۔ زبان و بیان کی اصلاح مولانا شبلی نعمانی سے لی۔ دیباچۂ کتاب کے آخر میں رقم طراز ہیں: "مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی"[۷]۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے کتاب کا عنوان علم الاقتصاد منتخب کیا جب کہ ابھی معاشیات کے لیے "الاقتصاد" کی اصطلاح کو بہت قبول عام نہیں حاصل ہوا تھا۔ کتاب اسلامی معاشیات پر نہیں ہے مگر اس میں روایتی معاشیات پر علامہ اقبال کے بعض خیالات بعد میں اسلامی معاشیات میں نقد و نظر کا اہم موضوع قرار پائے مثلاً ملکیت زمین، انفرادی و قومی ملکیت کا تصور، تعدد ازدواج، ضبط ولادت، افلاس و غربت کا خاتمہ وغیرہ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں، جب علامہ اقبال نے معاشیات پر لکھنا اور سوچنا شروع کیا، وہ زمانہ تھا جب سرمایہ داری اور اشتراکیت باہم دست بگریباں تھے۔ نظام سرمایہ داری پینترے بدل بدل کر سامنے آ رہا تھا اور اشتراکی نظام اپنے قیام کے لیے کوشاں تھا، چنانچہ ۱۹۱۷ء میں وہ دنیا کے

---

(۴) ماخذ سابق، ص: ۴۔

(۵) ماخذ سابق، ص: ۵۔

(۶) مشہور ماہنامہ مخزن لاہور کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۴ء کے آخر میں ایک اشتہار دیا گیا تھا جس میں علامہ اقبال کی کتاب علم الاقتصاد کے چھپ جانے کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ کتاب کا سال اشاعت ۱۹۰۴ء ہے۔

(۷) اقبال، علم الاقتصاد، ص: ۵۔

ایک حصے پر قائم بھی ہو گیا جو اہل دانش اور پالیسی ساز اداروں میں بہت سی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علامہ اقبال نے اسلامی معاشیات پر کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ ہی اسلامی معاشیات پر کوئی رسالہ یا مقالہ لکھا۔ البتہ انھوں نے اپنے بعض مکاتیب اور کچھ تقاریر و خطبات میں اپنے معاشی افکار و تصورات کا اظہار کیا ہے[۸]۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس مقصد کے لیے اپنی شاعری سے بھرپور کام لیا۔ اس لیے علامہ کے معاشی افکار کو سمجھنے کے لیے اس مضمون میں ہم زیادہ تر ان کی شاعری پر اعتماد کریں گے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اشتراکیت و سرمایہ داری کے تصادم میں علامہ نے محسوس کیا کہ اشتراکیت مظلوموں، بے کسوں اور کمزور و پس ماندہ طبقات کی حمایت اور ان کو سرمایہ داری کے ظلم وستم اور استحصال سے نجات دلانے کی دعوے دار ہے۔ اس لیے علامہ اقبال نے اس کے اس پہلو کی زوردار حمایت کی۔ چنانچہ فرشتوں سے فرمان خداوندی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز دروں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مارکس کے بارے میں فرمایا:

---

(۸) ۱۹۳۶ء میں تحریر رسالہ التحکیم میں ضبط ولادت پر مضمون ہے۔ ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۸ء تک قائداعظم محمد علی جناح سے خط و کتابت میں ان کی بہت سی معاشی آراء ملتی ہیں۔ مبشرہ، عابدہ، علم الاقتصاد: مقدمہ ترتیب وتحشیہ، اقبال اکیڈمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶۔

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

یہ اشعار اقبال کی فکر کے ارتقائی مراحل کے آغاز میں ارشاد ہوئے۔ ان کے بعد کے خیالات اور پختہ فکر کا اظہار ان کی شاعری کے آئندہ اور اغلب حصہ میں ہوا جن کے نمونے نیچے کے صفحات میں پیش ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا نوعیت کے ابتدائی اشعار کی وجہ سے اقبال کے بارے میں یہ بحث ہونے لگی کہ کیا اقبال اشتراکی نظریہ رکھتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم کے نزدیک اقبال نے زمینوں کو قومی ملکیت میں لینے کی حمایت کی ہے[۹]۔ حنیف رامے کا کہنا ہے کہ اقبال بہت سی اشتراکی پالیسیوں کے اپنانے کے حق میں تھے[۱۰]، جب کہ محمد عثمان[۱۱] اور جگن ناتھ آزاد[۱۲] نے اپنی تحقیقات میں ثابت کیا ہے کہ اقبال نے اشتراکیت کو رد کیا ہے۔

اقبال نے قیام یورپ کے دوران سرمایہ داری کی خرابیاں خود ملاحظہ کی تھیں اس لیے اس نظام کی تائید کا کوئی سوال نہیں تھا، البتہ کوشش کی کہ اس کے نقائص سے پردہ اٹھائیں تاکہ اس کی خیرہ کن چمک دمک سے لوگ فریب نہ کھائیں۔ وہ سرمایہ داری کو زمین پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں:

بدوش زمین بار سرمایہ دار
ندارد گذشت از خور و خواب کار[۱۳]

یعنی سرمایہ دار زمین کے کندھوں پر ایک بوجھ ہے۔ اسے سونے اور کھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔

اقبال سرمایہ داری کو ایک ظالمانہ واستبدادی نظام سمجھتے ہیں:

---

[۹] خلیفہ عبدالحکیم *Islam and Communism,* Lahore, Institute of Islamic Culture, 1969, p. 213۔

[۱۰] محمد حنیف رامے، اقبال اور سوشلزم، البیان، لاہور ۱۹۷۰ء، ص:۵۔

[۱۱] محمد عثمان، حیات اقبال کا ایک جذباتی دور، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

[۱۲] جگن ناتھ آزاد، ”اقبال، اسلام اور اشتراکیت“، معارف اعظم گڑھ، جلد ۱۱۷، شمارہ ۲۵، فروری۔مارچ، ۱۹۷۶ء۔

[۱۳] پیام مشرق، ناشر جاوید اقبال، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص:۲۰۵۔

از ضعیفان نان ربودن حکمت است
از تن شاں جان ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است (۱۴)

اقبال کی نظر میں سرمایہ داری کا خاتمہ تقریباً طے ہے:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روز مکافات (۱۵)

مزید فرمایا:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے (۱۶)

اقبال سرمایہ داروں کے استحصال سے محنت کش طبقہ کو خبر دار کرتے ہوئے گویا ہیں:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات (۱۷)

اس طرح اقبال اپنی شاعری میں جابجا سرمایہ داری کی خرابیوں سے لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں اور اس کی چالوں سے خبر دار رہنے اور بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے، علامہ اقبال اپنی فکر کے ابتدائی دور میں اس کے بعض صحت مند پہلوؤں کی تعریف کرتے ہیں مثلاً: وہ زمین کی شخصی ملکیت کے مخالف نظر آتے ہیں اور زمین پر حق اس کا سمجھتے ہیں جو اس پر کاشت کرے:

اے خدایا! یہ زمین تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں (۱۸)

---

(۱۴) مثنوی پس چہ باید کرد، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور، ب۔ت، ص: ۳۸۔

(۱۵) کلیات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص: ۶۳۴۔

(۱۶) بانگ درا۔ شامل در کلیات اقبال، ماخذ سابق

(۱۷) کلیات اقبال، ص: ۲۹۲۔

اسی طرح اشتراکیت نے عوامل پیداوار پر تقسیم سے فاضل مال کو عامۃ الناس کی ضرورتوں کے لیے خرچ کرنے کے لیے حکومت کو ذمے دار بنا کر گویا آیت یَسْأَلُونَکَ مَاذَا یُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ:۲۱۹) کی تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ:

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس عہد میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار [۱۹]

مذکورہ بالا اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اشتراکی تعلیمات کے ان پہلوؤں کو مثبت طور پر لیا ہے جن کی اسلامی تعلیمات سے مماثلت معلوم ہوتی ہے ورنہ انھوں نے اس نظام معیشت کو بھی تنقید کی نظر سے دیکھا ہے۔ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کو علامہ نے مدیر "زمیندار" کو ایک خط میں لکھا کہ وہ بالشویک خیالات رکھنے والے کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ انسانوں کے اقتصادی مسائل کا بہترین حل قرآنی تعلیمات میں ہے [۲۰]۔

آل احمد سرور کے نام ایک خط میں بھی انھوں نے فاشزم، کمیونزم اور زمانۂ حال کے ہر اِزم کے مقابلہ میں اسلام کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا ہے [۲۱]۔

کارل مارکس کے مادّی نظریات پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دینِ آں پیغمبرِ حق نا شناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس [۲۲]

الٰہی ہدایات سے عاری ہر نظام کو وہ تباہی و بربادی کا ذریعہ سمجھتے ہیں:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی [۲۳]

---

[۱۸] کلیات اقبال، ص: ۴۴۷۔

[۱۹] کلیات اقبال، ص: ۴۴۸۔

[۲۰] بحوالہ گفتار اقبال، مرتب محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۶۔

[۲۱] اقبال نامہ، جلد دوم، ص: ۳۱۴۔

[۲۲] جاوید نامہ، ص: ۲۵۔

[۲۳] کلیات اقبال، ص: ۳۷۴۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اشتراکی نظام حکومت میں فرد کی جگہ حکمراں پارٹی کی آمریت لے لیتی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار علامہ نے درج ذیل شعر میں کیا ہے:

زمامِ کارگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی [۲۴]

غرض یہ کہ اقبال سرمایہ داری و اشتراکیت دونوں کو مادی و اخلاقی قدروں سے عاری ہونے کی وجہ سے ہدفِ تنقید بناتے ہیں:

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس و آدم فریب
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل [۲۵]

علامہ اقبال نے وقت کے ان دو نمایاں نظامہائے معیشت کی تنقیص و تردید پر صرف اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اشعار میں اس کے نعم البدل اسلامی معاشیات کی ترجمانی بھی کی اور اس کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول بھی کرائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بعض مصنفین نے بیسویں صدی میں اسلامی معاشیات کا میر کارواں گردانا ہے۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کہتے ہیں: شاعر مشرق کا یہ تنہا امتیاز ہے کہ انھوں نے (اپنی شاعری میں) مغربی سرمایہ داری اور اس کے انتہائی ردّ عمل روسی کمیونزم کا اسلامی جواب پیش کیا۔ انھوں نے ان دونوں نظاموں کی خرابیوں کو بے نقاب کیا اور اس سلسلہ میں متوازن موقف کو اجاگر کیا۔ انھوں نے امت کو دعوت دی کہ وہ راہِ اعتدال پر گامزن رہتے ہوئے نوع انسانی کے تجربات اور اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے میں دریغ نہ کرے [۲۶]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محمد اقبال کی شاعری نے ہندوستان میں اسلامی معاشیات پر لکھنے والوں

---

[۲۴] کلیات اقبال، ص: ۳۷۴۔

[۲۵] جاوید نامہ، ص: ۶۹۔

[۲۶] محمد نجات اللہ صدیقی، *Recent works on History of Islamic Economic Thought*, Jeddah, ICRIE, 1982, p.54.

کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ چنانچہ گذشتہ صدی کی تیسری دہائی میں جب اسلامی معاشیات پر علماء ودانشوروں کی توجہ ہوئی تو سب سے پہلے انھوں نے سرمایہ داری، کمیونزم اور اشتراکیت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، ان کو اقبال کی شاعری میں بہت سی اسلامی معاشی تعلیمات کی طرف رہنمائی ملی۔ مثلاً انفاق پر قرآنی تعلیمات کی تاکید ان کو اقبال کی شاعری میں ملی:

ہیچ خیر از مردک زرکش مجو
لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُوا (۲۷)

یعنی سیم وزر کی ذخیرہ اندوزی سے کسی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے بلکہ جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے، اپنے پسندیدہ مالوں کے خرچ کیے بغیر بھلائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ علامہ نے اپنی شاعری میں سرمایہ داروں کے بینکنگ نظام اور سودی کاروبار کی مذمت بھی کی ہے:

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات

چنانچہ اسلامی معاشیات میں آغاز ہی سے علمائے اسلام نے سود کی خرابیوں اور اس کے نعم البدل کے طور پر بلاسودی بینک کاری کے خدوخال نمایاں کرنے میں اپنی محنت صرف کی، جس کے نتیجے میں پوری دنیا میں غیر سودی بینک کاری کا ایک پورا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اسلامی معاشیات بھی، جس کی طرف علامہ نے اپنی شاعری میں رہنمائی کا آغاز کیا تھا، بعد کے علمانے اسلامی معاشیات کے علم کی پوری عمارت کھڑی کر دی جو اس وقت دنیا کی متعدد جامعات میں تدریس کا موضوع ہے اور جس پر ریسرچ کے بہت سے ادارے ومراکز قائم ہوگئے ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال کو اسلامی معاشیات کا میر کارواں سمجھنا صحیح ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے ان کی مکمل شاعری کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

---

(۲۷) جاوید نامہ، ص: ۸۹۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعۂ ادیان

(ہندوستانی ادیان کے تناظر میں)

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

ubfzdqasmi@gmail.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲ء) کی علمی و تحقیقی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انہوں نے قرآن و ترجمۂ قرآن، فقہ و اصول فقہ، حدیث و تخریج حدیث، قانون بین الممالک اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متنوع اور جدید جہات سے دنیائے علم کو واقف کرایا۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے تمام گوشوں اور نکات کو اجاگر کر دیا۔ آپ کی تحریروں میں تشنگی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا ہے۔ البتہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی تحقیقات اور علمی کاوشیں بہت وقیع اور جامع ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تصنیفات و تالیفات کئی زبانوں میں دستیاب ہیں۔ انگریزی، عربی اور اردو کے علاوہ فرنچ، جرمن، اطالوی، ترکی جیسی زبانوں پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو عموماً علماء کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ شناخت اور آپ کا منفرد و جداگانہ تحقیقی شعور آپ کے علمی رتبہ و فضل کو بڑھاتا ہے۔ سیرت پر آپ کی معروف کتابیں "محمد رسول اللہ" (یہ کتاب اصل فرنچ میں لکھی تھی اب اس کا اردو ترجمہ "محمد رسول اللہ" کے نام سے دستیاب ہے)، عہد نبوی کا نظام حکمرانی، عہد نبوی کے میدان جنگ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، الوثائق السیاسیۃ معروف و متداول ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ نے قانون بین الممالک پر نہایت اہم کتاب تصنیف کی اور پہلے مرتبہ قانون بین الممالک جیسی اصطلاح سے دنیا کو متعارف کرایا۔ یوں آپ کی علمی و فکری جہات کے شعبے گوناگوں ہیں۔ آپ کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان سلیس اور سادہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تحریریں قاری کے دل و دماغ کو پوری طرح متوجہ کر لیتی ہیں۔ کتاب

و تحریر کا ہر لفظ تحقیق سے مملو نظر آتا ہے۔ جس موضوع کو اٹھا کر دیکھئے وہ اپنے آپ میں ایک دستاویز و سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس مضمون میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تقابل ادیان خصوصاً غیر سامی ادیان کے متعلق افکار کا مطالعہ مقصود ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات میں تقابل ادیان پر مستقل کوئی کتاب نہیں ہے لیکن آپ نے متعدد کتب میں تقابل ادیان کے متعلق جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مثلاً خطبات بھاول پور، رسول کریم ﷺ کی سیاسی زندگی، *Introduction of Islam*، تراجم قرآن وغیرہ میں ایسی بحثیں ملتی ہیں۔ لیکن جن حضرات نے ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت و سوانح پر گفتگو کی ہے انہوں نے ان کے مطالعۂ ادیان کے گوشے کو تشنہ چھوڑا ہے۔

تقابل ادیان کی طرف متوجہ ہونے کے اسباب: اگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتب اور جملہ تحریروں کو بغور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی کاوشوں میں تقابل ادیان پر بڑی مفید بحثیں ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ متعدد زبانوں کے ماہر تھے جس کی وجہ سے دیگر تہذیبوں اور ان کا مذہبی لٹریچر آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ اس لئے تقابل ادیان پر آپ نے اپنی کتابوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ اسی طرح آپ مغربی تہذیب سے ایک زمانے تک وابستہ رہے۔ ان کی تہذیب، عقائد و نظریات اور دین کو جاننے کی کوشش کی۔ پروفیسر عبد القیوم قریشی نے خطبات بھاول پور کے تعارف میں (☆) ڈاکٹر حمید اللہ کی تقابل ادیان میں دلچسپیوں کے محرکات و اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ڈاکٹر صاحب السنۂ شرقیہ یعنی اردو فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آپ کو اسی لسانی مہارت سے بڑی

(☆) ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس پر پروفیسر موصوف نے اہم تعارف لکھا ہے۔

مدد ملی۔[۱]

ڈاکٹر محمد عبد اللہ نے ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعہ ٔ ادیان و مذاہب" تحریر کیا ہے جس میں رقم طراز ہیں:

> مغرب کے مسیحی پس منظر کے پیش نظر ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی تصنیفات کے ذریعے اسلام اور دیگر مذاہب بالخصوص مسیحیت کا تقابلی جائزہ پیش کرتے رہے۔ فرانس کے بعض اشاعتی اداروں نے مختلف دینیاتی و مذہبی مسائل پر ایسی کتب شائع کی ہیں جن میں مختلف مذاہب کے علماء کی تحریریں، جن میں مصنفین نے اپنے مذہب کا موقف پیش کیا ہے، شامل کی گئی ہیں۔ محمد حمید اللہ ایسی متعدد کتب کے شریک مصنف ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شائع ہوئی ہے۔ تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کا ایک باب ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلا ہے جبکہ بقیہ دو ابواب یہودی اور عیسائی علماء کے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور ان کی دعوت تعلیمات کو اسلامی مآخذ کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب اپنی علالت سے قبل مسیحی اور اسلامی مآخذ کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بھی تصنیف کر رہے تھے۔ نیز ڈاکٹر صاحب دعوت اسلام کے سلسلے میں دیگر مذاہب خصوصاً مسیحیت کے تقابلی مطالعے پر بڑا زور دیتے تھے۔[۲]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے اندر تقابل ادیان کے جو محرکات آئے، وہ ان کی مغرب میں رہائش اور متعدد زبانوں کے ماہر ہونے کی وجہ سے تھے۔

مذاہب عالم کے مصلحین: ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے نہایت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ اپنی معروف کتاب *Introduction of Islam*[☆] میں مذاہب عالم کے مصلحین کے متعلق رقم طراز ہیں:

> انسانی تاریخ میں ایسی شخصیات کی کمی نہیں جنہوں نے اپنی زندگی اپنی قوموں کی سماجی اور مذہبی

[۱] محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء ص: ۱۵

[۲] محمد عبد اللہ، مقالہ "ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعہ ٔ ادیان و مذاہب"، ص: ۳۱۳، ویب سائٹ: https://id.scribd.com

[☆] اس کتاب کا اردو ترجمہ سید خالد جاوید مشہدی نے کیا ہے۔ اور یہ لاہور سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔

اصلاح کے لیے وقف کر دی۔ ایسے افراد ہر دور اور ہر ملک میں موجود رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ویدوں کے تخلیق کار تھے وہاں گوتم بدھ بھی تھا۔ چین میں اس شخصیت کا نام کنفیوشس جبکہ ایران میں اویستا تھا۔ سرزمین بابل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو جنم دیا جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصلحین میں ہوتا ہے۔ اہل یہود اپنے پیغمبروں اور مصلحوں کی ایک طویل لڑی پر بجا طور پر نازاں ہیں ان میں موسیٰ، صموئیل، داؤد، سلیمان اور عیسیٰ علیہم السلام کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ [۳]

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان انبیاء پر نازل ہونے والے صحیفے اور کتب پوری طرح مسخ ہو چکی ہیں۔

ہندومت کی کتب: ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''خطبات بہاولپور'' میں ہندومت کی کتب کے متعلق نہایت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں:

مجوسیوں کا مذہب زرتشت کی لائی ہوئی کتاب اوستا پر مبنی ہے۔ اوستا کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ زرتشت کی کتاب اس وقت کی ژند زبان میں تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی، پرانی زبان متروک ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مٹھی بھر عالم اور متخصصین کے سوا ژند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زرتشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پاژند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصے میں بھی کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہرحال دنیا کی ایک اہم کتاب کو اوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ [۴]

اس کے بعد ہندومت کی کتب کے متعلق لکھتے ہیں:

ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا

---

[۳] محمد حمید اللہ، اسلام کیا ہے، مترجم: سید خالد جاوید مشہدی، بیکن بکس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۷

[۴] خطبات بہاولپور، ص: ۲

مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں، بشر طیکہ وہ نبی ہوں۔ ان میں خصوصاً پران نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ پران وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا، قدیم ہے۔ اس کی طرف قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتاہے:وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے)۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہر حال دس پران ہیں ان میں بھی آخری نبیؐ کے بارے میں پیشین گوئی موجود ہے۔ (۵)

یہ کہا جاسکتاہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے ہندو مت کا بارک بینی سے مطالعہ کیا تھا تبھی وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوؤں کا صرف ویدوں کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ الہامی ہیں۔ بقیہ کتابوں پران کا اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہے جبکہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ کہنا کہ وید کے علاوہ اپنشد اور پران کے متعلق بھی ہندوؤں کا دعویٰ "الہامی" ہونے کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ البتہ یہ ان کا اپنا نظریہ ہے جس سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے دیگر مذاہب کی کتب کے متعلق روادارانہ اور معتدل رویہ اپنایاہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

> اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹاہے، تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کرلے، تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں، تو اسے دکھ ہو گا اور غالباً وہ جوش غضب سے اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ اس کے بر خلاف اگر اسے یہ کہوں کہ تمہارا دین بھی سچاہے، تمہارے ہاں کی کتاب بھی سچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے اور وہی اللہ جس نے تمہیں یہ کتاب دی اس نے ایک آخری کتاب بھی بھیجی ہے، تم اس کو پڑھو اور غور کرکے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے، وہ نسبتاً زیادہ خوش دلی کے ساتھ پڑھنے اور غور کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان

---

(۵) ماخذ سابق، ص:۳۰

لانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی وہی فراخ دلی، وسیع القلبی اور تحمل و رواداری کا پہلو نظر آتا ہے۔[۶]

موصوف کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ آج ہمارے رویے میں اعتدال و میانہ روی سے زیادہ ترشی، تلخی پائی جاتی ہے اور مصلحت و موقع شناسی یکایک مفقود ہو چکی ہے جبکہ وقت اور حالات کا تقاضایہ ہے کہ ہم فراخ دلی اور وسیع القلبی کا عملی مظاہرہ کریں۔

عبادت کا تصور: دنیا کے ہر دین میں عبادت کا تصور پایا جاتا ہے۔ سب کے عبادت کرنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ اسی اعتبار سے وہ اپنی اس مذہبی رسم کی ادائیگی کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے غیر سامی ادیان میں عبادت کے متعلق لکھا ہے:

ہندوستان میں جب آریا آئے تو انہوں نے اپنی زرعی معیشت میں گائے کو سب سے زیادہ مفید اور منفعت بخش پایا، تو خدا کی اس سب سے بڑی نعمت کے گن گانے لگے اور خدا کی نعمتوں کی سب سے بڑی علامت کے طور پر اس کا احترام کرنے لگے۔ اللہ ایک منعم ہے۔ لہذا اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ اس کی سب سے اچھی عمر کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں یوں بالواسطہ وہ اللہ کا ادب کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی تعریف کرنا چاہتے ہیں[۷]۔

روزہ کا مفہوم ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے:

ہندوؤں کے یہاں روزہ ہے لیکن زمانہ اور تعداد معین نہیں اور لزوم بھی کم ہے۔ بانیان مذہب کی تاریخ پیدائش اور سورج گرہن اور چاند گرہن جیسے اثر انداز کرشمہ ہائے قدرت کے موقعوں پر دین دار لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ اور سہ پہر کے تقریباً تین بجے افطار کر لیتے ہیں۔[۸]

اسی طرح حج کے متعلق گویا ہیں:

دوسری قوموں کا حج یا تو اپنے کسی بزرگ، کسی ولی، کسی بانی مذہب کی زیارت کرنا ہے یا مظاہر قدرت اور عجائبات میں سے کسی بہت عجیب چیز کی زیارت کرنا ہے۔ چنانچہ ہندو دریائے گنگا

---

[۶] ماخذ سابق، ص:۱۶۱-۱۶۲

[۷] ماخذ سابق، ص:۱۷۳

[۸] ماخذ سابق، ص:۱۷۷

کے منبع کی زیارت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ہے۔ دریائے گنگا اور جمنا کا سنگم الہ آباد کے مقام پر ہے۔ اس کی زیارت میں بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔[۹]

تناسخ ارواح کا مفہوم: ہر مذہب کے یہاں دوزخ اور جنت کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص دنیا میں اچھے اعمال کرے گا تو اس کو دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اجر عطا کیا جائے گا۔ اگر کوئی فرد بدی اور کریہہ چیزوں میں لت پت رہے گا تو اس کو اسی طرح کا بدلہ ملے گا۔ ہندو مت میں بھی اس طرح کا نظریہ ملتا ہے۔ اس کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب خطبات بھاول پور میں یوں بیان کیا ہے:

> ہندوؤں اور بدھ مت والوں کا تصور اس کے بارے میں کچھ اور ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا وجود ازل سے ابد تک صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک بلبلے کا وجود، جو دریا میں موج تلاطم سے پانی کی سطح سے اچھل پڑتا ہے پھر آن کی آن میں دوبارہ گر کر دریا کے پانی میں غائب ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہستی بھی اس کائنات کے محض ایک جزو کی ہے۔ اسی طرح ان کا تصور تناسخ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اچھا کام کرے تو اسے جزا ملے گی، اور اگر برا کام کرے گا تو سزا ملے گی۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ ہے کہ وہ سزا اس برائی کی نوعیت کے مطابق ہو گی۔ اگر اس نے تھوڑی برائی کی ہے، مثلاً وہ بادشاہ ہے تو مرنے کے بعد غلام کے طور پر پیدا ہو گا، اگر اس نے اس سے بھی زیادہ برائی کی ہے تو وہ مرنے کے بعد کتا یا بلی بن جائے گا، اس کی برائی اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو وہ درخت بنے گا، اس سے بھی بڑی برائی کی ہے تو وہ پتھر بن جائے گا۔ جمادات، نباتات، حیوانات یہ سب ارتقاء کی مدارج ہیں۔ اسی لحاظ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو پتھر بننے کی سزا دی گئی تو اس پتھر کو ارتقاء کے ذریعے سے صدیوں کی مدت کے بعد درخت بننے کا موقع ملے گا، اگر درخت اپنی مدت حیات میں مفید کام کرتا ہے تو اس درخت کو صدیوں بعد جانور بننے کا موقع ملے گا، اگر شودر کی حیثیت سے انسان اچھے کام کرتا رہے اور فرائض انجام دیتا رہے تو وہ مرنے کے بعد ویش بنے گا، اس کے بعد کھشتری بنے گا، اس کے بعد برہمن بنے گا، اگر برہمن کی حیثیت سے

---

[۹] ماخذ سابق، ص: ۱۷۶-۱۷۷

اپنی زندگی اچھی گزاری تو مرنے کے بعد خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔ جس طرح کہ وہ بلبلہ پانی میں دوبارہ گرا اور پانی بن گیا، برہمن دوبارہ خدا بن جائے گا۔ اگر برہمن نے زندگی برائی کے ساتھ گزاری تو اسے وہی سزا ملے گی اور یہ ان کا آوا گون یا تناسخ کا تصور ہے۔[۱۰]

کیا بدھ مت کا ذکر قرآن میں ہے؟: ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب ''خطبات بہاولپور'' میں ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے:

قرآن مجید میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن و حدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے۔ بعض محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں اگرچہ لکھا ہے، لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کفل کے بارے میں کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل ''کپل وستو'' کی معرب شکل ہے جو بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے۔ اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورہ التین کی آیات ۱ تا ۳ کی طرف اشارہ فرماتے تھے جس میں تمام مفسرین کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے، سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف، بلد الامین سے حضور اکرم ﷺ کی طرف۔ والتین کیا ہے؟ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت نہیں رہی جبکہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے بڑے مذاہب کا ذکر ہے وہاں بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا۔[۱۱]

---

[۱۰] ماخذ سابق، ص:۱۶۸-۱۶۹

[۱۱] ماخذ سابق، ص:۲۷۵-۲۷۶

اس اقتباس کے سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ اہل علم کو اس سے اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

خوش آئند اقدام: ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے تقابل ادیان اور تہذیبی تنوع پر کئی اہم مقالے بھی لکھے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا کہ ان کی ادیان اور اقوام کے رسوم و رواج اور تہذیبوں کے متعلق کافی گرفت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تقابل ادیان جیسی علمی بحثیں گاہ بگاہ مل جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے فرانسیسی ترجمۂ قرآن میں بھی مذاہبِ عالم سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اُردو زبان کے ہندو شاعر پنڈت جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جو Hommage a Mahomet کے نام سے معروف ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۹۰ میں ہوئی ہے۔ اس سے انہوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ صرف مذہبی اہل علم یعنی مسلمانوں نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف نہیں کرتے ہیں بلکہ ہندوؤں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت پیش کی ہے۔[۱۲]

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان میں اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ یقیناً ان سے قومی ہم آہنگی کو فروغ ملے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مذکورہ بالا افکار علمی نقطۂ نظر سے اہم ہیں، وہیں ان کی افادیت و معنویت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ غیر سامی ادیان پر حمید اللہ کی جو آراء پیش کی گئی ہیں وہ اہل علم و فکر اور مطالعۂ ادیان کے ماہرین کو کئی اعتبار سے غور و فکر کے پہلو فراہم کرتی ہیں۔

---

[۱۲] جگن ناتھ آزاد کے اس نعتیہ مجموعۂ کلام کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ سنہ ۱۹۹۰ میں شائع ہوا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جگن ناتھ آزاد کا پہلا نعتیہ مجموعہ کلام ۱۹۹۹ میں شائع ہوا۔ اس سے قبل ان کی نعتیں مختلف اُردو اخبارات اور رسائل و جرائد میں چھپتی رہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے مجموعۂ کلام کا نام "نسیم حجاز" ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا یہ نعتیہ کلام ماہنامہ "آستانہ" دہلی، ہفت روزہ "استقلال" لاہور، ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ اور ماہنامہ "شام و سحر" لاہور میں شائع ہوتا رہا تھا۔

غلام رسول مہر بحیثیت ناقد غالب :ایک تنقیدی مطالعہ

اسعد اللہ

ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

asadullahjnu@gmail.com

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ شاعری کی دنیا میں ایک بڑا نام ہے جس پر نقد و تحقیق کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے اور آج تک اسے مکمل طور سے فہم و ادراک میں نہیں لایا جا سکا ہے۔ یہی غالب کے آفاقی شاعر ہونے کی دلیل ہے کہ وہ ہر زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق اپنی شاعری اور سوچ سے دنیا کو متاثر کرتا رہا ہے۔ ہم اس مقالے میں غالب کی شعری کائنات اور اس کے خطوط کے اولین مرتبین میں سے ایک نا آفریدہ ناقد غلام رسول مہرؔ کی تنقیدی بصیرت کا جائزہ پیش کریں گے۔ مہرؔ کے نہاں خانۂ قلم میں غالب کی شاعری اور اُن کی زندگی سے پیوستہ کئی پرتیں موجود ہیں جو کسی جوہری کی نگاہِ کرم کی منتظر ہیں۔ مہر نے اپنے قلم سے غالب کو سنگ مرمر کی طرح تراش کر کتابی شکل میں شائقینِ غالب کی خدمت میں پیش کیا لیکن وقت کی دھول، ان کے قلم کی گہرائی پر ناگ منی کی طرح براجمان ہو گئی اور یوں غالب پر کی گئی ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں نالۂ خام ثابت ہوئیں جو کسی بلبل شوریدہ کی تلاش میں ہیں۔ یہاں ہم مہرؔ کی صحافیانہ زندگی اور ان کی دیگر خدمات کا احاطہ نہ کرتے ہوئے صرف موضوع پر توجہ مرکوز کریں گے۔

غالبیات کے باب میں غلام رسول مہرؔ کا قلم تاج محل کا وہ سنگ مرمر ہے کہ جس کو اکھاڑ کر پھینکا نہیں جا سکتا اور اگر تزئین کاری کے نام پر پھینک دیا گیا تو جس طرح تاج محل کی خوبصورتی پر حرف آئے گا ٹھیک اسی طرح سے غالبیات کے باب میں اِس کو وہ نور کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ مہرؔ نے غالب کی سوانح 'غالب'، دیوان غالب کی شرح 'نوائے سروش'، غالب کے قصائد و مثنویات فارسی، غالب کے خطوط کے مجموعے 'خطوط غالب کامل' اور 'فرہنگ غالب' کو اُس وقت شروع کیا جب ملک غلامی کی زنجیروں اور انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔ ادبی تاریخ پر نظر رکھنے

والے جانتے ہیں کہ اُس وقت وسائل کی دستیابی کس پتہ ماری کا کام ہوا کرتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں مہرؔ نے اپنی پوری جانفشانی اور شدت کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جس کی تعریف و توصیف اُس وقت کے اہم ادیبوں اور قلمکاروں نے بے لاگ لپیٹ کیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب پر لکھے گئے ان کے مضامین اور مقالوں کو اہمیت دی جاتی رہی ہے جو کہ 'آجکل'، 'جامعہ'، 'مخزن'، 'نقوش' اور 'فنون' جیسے معرکۃ الآراء سالوں کی زینت بنتے رہے۔

مہرؔ نے غالب پر اپنی مستقل تصنیف و تالیف کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ غالب کی شاعری اور ان کی فکر پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مہرؔ قمطراز ہیں کہ ''شاعری کا جوہر انھیں مبدأ فیاض سے ملا تھا۔ طبیعت دقت پسند تھی۔ میرزا نے عبدالقادر بیدل کا کلام پڑھا تو بیدل ہی کے رنگ میں اُردو شعر کہنے لگے۔ اس دور کا کلام نسخۂ حمیدیہ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل شروع میں میرزا کے دل و دماغ پر بے طرح مسلط تھے۔ انھوں نے مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے جیسے جیسے طبیعت میں پختگی آتی گئی طرز فکر و نظر میں تبدیلی یا کہنا چاہیے صفائی اور پختگی آتی گئی۔ پھر وہ فارسی گوئی پر متوجہ ہوئے یہاں تک کہ دور متوسط میں اُردو کے بجائے وہ فارسی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ دہلی میں قیام کے بعد اس زمانے کے شاعروں کے عام طریقے کے مطابق انھوں نے شاہی دربار سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرفی اور نظیری کے ہم پایہ تھے لیکن ان کے زمانے کا شاہی دربار مغلوں کی سطوت و شوکت کا محض ایک بے رنگ نقش رہ گیا تھا۔ اس لیے میرزا کا کمال شاعری جس قدردانی و منزلت شناسی کا حق دار تھا وہ اسے نصیب نہ ہوئی۔''[۱]

غالب پر کام کرنے والوں نے مہرؔ کے اس خیال کی تائید تو کی لیکن نام کے ساتھ اپنی تحریروں میں لکھنا گوارانہ کیا۔ ہم مانتے ہیں کہ کسی کے خیالات سے استفادہ کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ ادب میں اس کی اہمیت ہے لیکن اپنے پیش روؤں کی تحریروں سے یکسر نظریں چرا لینا اور ان کئے گئے کاموں کو اس طور پر خاطر میں نہ لانا کہ کہیں اس سے آپ کی تحقیق پر حرف زنی نہ کی جائے کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ مہرؔ کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن سے گذشتہ پچاس دہائیوں کے سرکردہ ادیبوں نے خوشہ چینی کی ہے۔ بطور حوالہ فاروقی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جو ان کی کتاب 'غالب پر چار

---

[۱] غلام رسول مہر، غالبیات مہر، مرتبہ محمد عالم مختار حق، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۲۶۔

تحریریں' میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے مہرؔ کے خیالات اور قلم کی تائید کی ہے۔ بس فرق یہ کہ ہے زبان و بیان الگ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک حد تک تو خود غالب اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اوائل عمر سے لے کر ۲۸-۱۸۲۹ء تک وہ بیدل کی گرویدگی کا اعلان بار بار کرتے رہے، اردو میں زیادہ اور فارسی میں کم۔ لیکن فارسی میں عملاً انہوں نے بیدل پرستی کا اظہار یوں کیا کہ بیدل کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اپنی 'مثنوی چراغ دیر' انہوں نے صاف صاف بیدل کے تتبع میں لکھی اور غالباً ملاّ سابق بنارسی کی مثنوی 'تاثیر عشق' بھی ان کے سامنے تھی۔[۲]

غلام رسول مہر نے یہ مضمون مئی ۱۹۵۱ء میں لکھا تھا جو کہ غالب کے خطوط والے مجموعے میں شامل ہے جب کہ شمس الرحمن فاروقی کی عمر اس وقت محض پندرہ سال سات مہینے اور ۱۴ دن تھی۔ راقم کے مطالعے کی روشنی میں ایسے اور بھی اہل علم ہیں جنہوں نے مہرؔ سے استفادہ کیا تاہم بغیر حوالے کے۔ اس کے لئے الگ سے ایک مقالہ درکار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مہرؔ کے کارناموں کے قدرداں بھی موجود ہیں جنہوں نے ان کی اہمیت کو مسلم الثبوت سمجھا اور اس پر اپنی گراں قدر رائے بھی دی۔ جب مالک رام کی کتاب 'ذکر غالب' شائع ہونے والی تھی تو انہوں نے دیباچہ لکھنے کی گزارش سید عابد حسین سے کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "پچھلے سال ادبِ غالب میں دو گراں قدر کتابوں کا اضافہ ہوا۔ جناب مہر نے 'غالب' اور محمد اکرام نے 'غالب نامہ' تصنیف کرکے اس کام کی تکمیل کر دی جسے مولانا حالی نے شروع کیا تھا۔"[۳] مہرؔ نے غالب پر تسلسل کے ساتھ لکھا اور وہ غالب کو اس طرح سے پیش کرنا چاہتے تھے جس طرح سے کوئی آثار قدیمہ کا ماہر نہ صرف زیر تعمیر عمارت کے ہر ہر زاویہ کی عکسی اور معکوسی جائزہ لیتا ہے بلکہ اس میں استعمال ہونے والے گارے، چونے حتیٰ کہ اینٹ کا بھی جائزہ لیتا ہے جو تعمیر عمارت میں اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ آثار قدیمہ کا ماہر جب یہ دیکھتا ہے کہ مجوزہ عمارت کا نقشہ بھلے ہی مختصر ہے تاہم رقبہ وسیع ہے تو وہ ٹوپو گرافی (Topography) کے

[۲] شمس الرحمن فاروقی، غالب پر چار تحریریں، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، ص ۱۴-۱۵۔

[۳] مالک رام، ذکر غالب، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸ء، ص ۳۔

اصولوں کو بروئے کار لا کر عمارت کی ہر اکائی اور ہر ایک یونٹ کو الگ الگ تقسیم کرتا ہے جس سے وہ عمارت صدیوں تک محفوظ رہ سکے۔ ٹھیک اسی طرح سے غلام رسول مہرؔ نے خاکہ بنایا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس دنیا سے سدھار گئے۔ لیکن جو تحریریں ان کے قلم سے نکلیں اس نے غالبیات کے باب میں نئی جہتوں اور ایک نئے سروے کا دروازہ کھول دیا جس میں غالب کے شائقین، مطالعہ کر کے اپنی پسند کے مطابق پھول چن کر ہار بناتے رہے۔ مہرؔ کو معلوم تھا کہ غالب کی کل کائنات ان کا شعری دیوان اور خطوط ہیں تاہم انہوں نے اس مختصر مگر جامع ’کائنات‘ کی ہر زاویے سے تحقیق پیش کی۔ اُن کے مطابق ہندوستان کے اس ’رند پیشہ‘ کا ذکر اتنے تواتر اور اہتمام کے ساتھ کسی شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اگر مرزا پر لکھے گئے مقالات کو ہی جمع کر دیا جائے جو مجلے اور جرائد کی زینت ہیں تو اس کی کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> میرے محدود علم کی حد تک بعض پہلو ابھی تک یقیناً تشنۂ فکر و ترتیب ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کا ذکر سرسری طور پر کر دوں۔ شاید اس طرح ارباب علم و نظر کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو جائے اور یوں ہمارے لیے تحقیق و کاوش کا ایک نیا گراں قدر سرمایہ وجود میں آجائے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ میرزا نے شاعری میں کئی نئی چیزیں پیدا کیں جو ان سے پیش تر کہیں نظر بھی آتی ہیں تو نہ ان کی حیثیت ممتاز و نمایاں ہے اور نہ ان کی جزئیات میں ایسی جامعیت ملتی ہے جو میرزا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ایسی جدتیں فارسی میں بھی خاصی ہیں لیکن اُردو میں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُردو شاعری میں میرزا نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس سے اس کی زبان کے ممکنات ارتقا کمال پر پہنچ گئے اور ہر نوع کے مطالب بے تکلف بیان کرنے کی ایسی صلاحیتیں آشکارا ہو گئیں جو میرزا سے پہلے یا تو بروئے کار نہیں آئی تھیں یا ان میں ویسی وسعت اور دقیق جزئیات کے اظہار کی ہمہ گیری نہ تھی۔ اس اعتبار سے میرزا قدیم و جدید کے درمیان ایک زریں سلسلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے محدود علم کے مطابق ان کی شاعری کے اس پہلو پر اب تک زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا حالاں کہ یہ ان کی عظمت و رفعت کا اہم وثیقہ ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی غالباً نا مناسب نہ سمجھا جائے کہ نظم کے علاوہ میرزا نے اُردو نثر میں بھی ایک بدیع انداز کی طرح ڈالی۔ ان کی وفات پر ایک صدی گزر چکی ہے۔ اس مدت میں عالی منزلت ادیبوں کی ایک طویل صف کے درخشاں کارنامے اُردو زبان کا پرچم گراں مائیگی

اوج ثریا پر پہنچا چکے ہیں لیکن میرزا کی اُردو نثر آج بھی مختلف اعتبارات سے بیگانہ و یکتا ہے۔[۴]

غلام رسول مہرؔ نے اپنے دیگر مضامین و مقالات میں غالب کی شاعری کے دیگر پہلوؤں میں ان کی معجز نمائیوں کو بحسن و خوبی پیش کیا ہے۔ غالب کیوں کر بڑا شاعر ہے، اس کی شاعری کے وہ کون سے خاص پہلو ہیں جو مرزا کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتے ہیں۔ آیا صرف حسنِ تخیل ہے یا اچھوتا مضمون، زندگی کی گہرائیوں کا مطالعہ ہے یا بلند و بالا حقائق کی پیشکش۔ اِن تمام امور اور ضابطوں کے تحت مہرؔ نے مرزا کے شعری کائنات کو اپنی ژرف نگاہی اور بصیرت افروزی کے گلدان میں سجا کر قارئین کے حوالے کیا ہے۔ غلام رسول مہرؔ کے خیالات سے ممکن ہے آج کی نئی نسل اتفاق نہ کرے کیوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں ہی نہیں بدلتی بلکہ اصول اور ضابطے کی کسوٹی کو بھی نئے سرے سے متعارف کروانا پڑتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چیزیں وہی کارآمد اور امٹ ہوتی ہیں جن کا نقش کبھی ماند نہ پڑے جو وقت اور زمانے کے لحاظ سے خود کو اپڈیٹ کرتی رہیں۔ اس تناظر میں مرزا غالب کی شاعری پوری طرح سے اپنے دور کی عکاس ہی نہیں بلکہ مستقبل کے لئے ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور اس میں حرکت پذیری اور اثر اندازی کا ایک لائحۂ عمل مہیا کرتی ہے جس کے مطالعے سے قاری کے فکر و وجدان اور تخیل پر ایک نمایاں اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ غالب اور دیگر شعرا کو کلاسیکی معیار پر جب پرکھنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ بعض اشعار اس اصول اور ضابطے سے ہٹ کر ہوں لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ان اشعار کی کوئی اہمیت نہیں۔ بس کائنات کے مطالعے اور مشاہدے کا نظریہ قاری کو اپنے ذہن میں رکھنا ہوگا۔ فاروقی لکھتے ہیں:

> ہر زمانے کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ہر زمانہ اپنے ذوق کے مطابق اشعار اور شعرا کی درجہ بندی کرتا ہے۔ بڑے شاعر کے اکثر اشعار پر ہر زمانے میں اتفاق رائے کے باوجود ان اشعار کی معنویت اور مختلف اشعار کے مابین قبولیت اور ترجیح بھی مختلف ہوتی ہے۔ گذشتہ پچیس برس میں جس غالب سے ہم آشنا ہوتے ہیں وہ بڑی حد تک بجنوری اور شیخ اکرام کے غالب سے مختلف ہے لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ اب جو غالب ہمارے سامنے آئے گا وہ گزشتہ ربع صدی

---

[۴] غلام رسول مہر، غالبیات مہر، مرتبہ محمد عالم مختار حق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۹۰-۱۹۱۔

کے بھی غالب سے تھوڑا بہت مختلف ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا کو اردو کے کلاسیکی معیاروں اور اردو کی کلاسیکی شعریات کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش شروع ہو رہی ہے۔[۵]

غلام رسول مہرؔ نے مرزا کی شعری جامعیت، حقیقت بیانی، زندگی کی جلوہ ریزیوں، افق حیات کی نور پاشیوں کے سبب ہی اس کے تہہ داریوں تک پہونچے کی کوشش کی اور شعر کے جوہر، اس میں موجود معانی و مفاہیم، تشکیل اور ردّ تشکیل کے اصول کے ساتھ تماثل اور تخالف سبھی زاویوں سے غالب کو متعارف کرایا۔ اگر ہم موجودہ اصول نقد پر مہرؔ کے ان مضامین و مقالات اور تشریحات کو سامنے رکھیں تو ہمیں 'اکتشافی تنقید' کی ایک جھلک ضرور مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اکتشافی تنقید کے نظریے کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس میں سب سے اہم عنصر 'جوہر' ہے لیکن وہ مطلقیت کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ مہرؔ نے غالب پر جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں وہ بھلے ہی آج سے ساٹھ سال پہلے لکھے گئے ہوں تاہم ان میں اکتشافی تنقید کی رمق موجود ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

دراصل کسی بھی متن میں جوہر اور تجربہ موجود تو ہوتا ہے لیکن مطلقیت(Absolutism) کی حیثیت نہیں رکھتا یعنی متن میں جوہر کی موجودگی کسی ایک حتمی اور قطعی صورت اور حالت میں نہیں ہوتی بلکہ مصنف کے لسانی برتاؤ اور شعری التزام کے سبب متن میں جوہر یا تجربہ ایک سے زائد یا فاضل صورتوں اور حالتوں میں موجود ہوتا ہے مصنف کے ذریعے متن میں جوہر کی فاضل صورتوں اور حالتوں کے امکانات پیدا کرنے کے عمل کو دریدا نے معنی کی تخم کاری (Dissemination) قرار دیا ہے۔ یہ متن کے اصل جوہر کی بازیافت میں مدد پہنچاتی ہیں۔[۶]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو مہرؔ نے غالب کی شاعری اور فکر و خیالات کو ہر جہت سے جانچنے کی کوشش کی ہے اور اس کے اندر چھپے ہوئے معنی و مفہوم اور 'جوہر' کو بلا کم و کاست قاری کی سخن شناس آغوش میں رکھ دیا ہے جس کی تہوں میں پہونچ کر جوہر تلاش کرنا یا اس سے

---

[۵] غلام رسول مہر، غالبیات مہر، مرتبہ محمد عالم مختار حق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۵۶۔

[۶] قدوس جاوید، تنقید نظر اور نظریے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، ص ۱۲۰۔

فائدہ کیسے اور کیوں کر حاصل کیا جائے یہ اس کی صوابدید پر منحصر ہو گا۔اس کا اندازہ لگانا کہ آیا قاری غالب کا نغز گفتار نکتہ سنج ہے یا نہیں اس کا فیصلہ قلمکار نہیں بلکہ قاری کی اپنی 'لذت حکایت' اور 'ذوق حضوری'، 'طولِ دادم داستانے را' کے تقاضے کی متمنی ہوتی ہے۔

مہر کے غالب پر کئے گئے کاموں میں ایک گنجینۂ معنی کا طلسم موجود ہے جس کا اندازہ وہی اصحاب فکر و فن لگا سکتے ہیں جنہوں نے انتہائی محبت اور شیفتگی کے ساتھ غالب کے شعری دستاویز کی سیر کی ہو۔مہر کے تنقیدی قلم کو قطرے سے گہر ہونے تک کئی ایک حلقۂ صد کام نہنگوں کی موجوں سے واسطہ پڑا ہے۔اس سے نکھر کر جب انھوں نے 'غالبیات' کی کشتی میں قدم رکھا تو علمی دریا یا سمندر کی کوئی بھی موج انہیں باہر نہ پھینک سکی۔بلکہ مہر کے قلم سے جو بھی قطرہ نکلا وہ ادیبوں کی دنیا میں گوہر شہوار ٹھہرا۔ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> بزرگ نسل کے ماہرین غالبیات میں ذیل کے علما کو شمار کیا جاتا ہے:مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۵-۱۹۷۱)، قاضی عبدالودود (۱۸۹۶-۱۹۸۴)، امتیاز علی خان عرشی (۱۹۰۴-۱۹۸۱)، مالک رام (۱۹۰۶-۱۹۹۳)، شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸-۱۹۷۳)۔ان عناصر خمسہ میں بھی مالک رام آخری تھے۔[۷]

مہر نے غالب کی بابت راقم کی تحقیق کے مطابق سینتالیس مقالے اور مضامین لکھے ہیں جن میں سے کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔کچھ مضامین رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں، جنہیں یکجا نہیں کیا جاسکا ہے، ان پر راقم کی تحقیق جاری ہے۔نسخۂ حمیدیہ کی طباعت و تحقیق کی داستان، احوال غالب کی گمشدہ کڑیاں، غالب کی مقدماتی زندگی کی تفصیل، جنگ آزادی کے تناظر میں غالب کے خطوط کی اہمیت، لطائف غیبی، پنج آہنگ سمیت کئی مضامین ایسے ہیں جن پر تفصیل سے لکھا جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔اس کے علاوہ انھوں نے غالب کی عظمت اور ان کے فکر و فن پر سلسلہ وار مضامین لکھے ہیں، جب کہ بعض غزلوں اور منتخبہ اشعار کے تشریح کے علاوہ غالب کے دیوان کی مکمل شرح بھی پیش کی ہے۔یہی نہیں بلکہ غالب کے قصائد فارسی اور مثنویات کا بھی جامع اور مدلل جائزہ لیتے ہوئے اصلی مآخذ کے ساتھ تشریح کی ہے۔'محاسن کلام غالب' میں عبدالرحمٰن

---

[۷] ڈاکٹر گیان چند جین، غالب شناس مالک رام، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۔

بجنوری نے کیا پتے کی بات کہی ہے:

ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: مقدس وید اور دیوان غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حدّ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے، مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ جمال الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کا کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے کون سا 'پیکر تصویر' ہے جو اس کے 'کاغذی پیرہن' پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔[۸]

غلام رسول مہرؔ نے اپنی بساط بھر غالب کے تمام سرمائے پر گہرائی کے ساتھ نگاہ ڈالی اور اس وقت کے مروّجہ اصول تحقیق و تنقید کی روشنی میں اپنی نگارشات پیش کر دیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ کاوش تپتی ہوئی صحرا کے درمیان ایک جھلستے ہوئے درخت کے مانند کسی محقق کے انتظار میں تھی جو انہیں اپنے تحقیقی قلم کے پانی سے زندگی نو کا مژدہ سنا کر ان کی کاوشوں کو سرشار کرے۔ غالبیات کے باب میں مہرؔ کا قلم عمر خیام کی رباعی کا مصرعہ 'ایں راہ بہ کسی بگو ترا نہ شناسد' کے مانند ہے۔ جسے ادب کے باغ رضواں میں سیر سے مطلب ہے، نہ کہ کسی ستائش اور صلے کی تمنا۔ اگر ایک محقق کی نظر سے دیکھا جائے تو غالبیات کے باب میں غلام رسول مہرؔ کا قلم پردۂ ساز میں ایک 'گل نغمہ' ہے جسے وقت کی ساز نے 'گل خن' میں تبدیل کر دیا تھا جسے اب دوبارہ ادبی گلشن میں سجائے جانے کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ بطور ناقدِ غالب انہوں نے دورِ قدیم کے اس آخری کلاسیکی بلبل کے نظم و نثر کو تمام زاویوں سے پرکھ کر ایک نوید بشارت دی، جس میں صرف غالبیات کی دلکشی اور جاذبیت پر ہی بات نہیں کی بلکہ فن کی لالہ کاری اور میناکاری کی بابت بھی قارئین کے جناب میں جمال ایزدی کے حیرت انگیز نکتے بھی پیش کیے ہیں۔

---

[۸] عبدالرحمن بجنوری، محاسن کلام غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۶، ص ۹-۱۰۔

مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ بحیثیت فارسی شاعر

ڈاکٹر امیر عباس خان عامرؔ
پرشین اسکالر، دہلی یونیورسٹی

abbasameer59@gmail.com

مہاراجہ چندو لعل ابن رائے نرائن داس مدھیہ پردیش کے شہر برہانپور میں ۱۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن لاہور تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ ٹوڈر مل بادشاہ اکبر کے وزیر خزانہ تھے۔ ابھی دس برس کے تھے کہ والد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ شاداں کی پرورش ان کے شفیق چچا نانک رام کے زیر نگرانی ہوئی۔ میر لطف علی سے کسب علم کیا۔ اور سید زین العابدین ہمدمؔ طباطبائی شیر ازی سے فارسی پڑھی۔ تذکرۃ الاولیا اور نفحات الانس کے مطالب اور تصوف اور توحید کے مسائل اپنے چچا نانک رام سے سیکھے۔[۱]

راجہ صاحب کے جدامجد رائے مول چند نظام الملک آصف جاہ اول کی حکومت میں کمشنر کروڑگیری کے معزز عہدے پر فائز تھے۔ انکے بعد یہ عہدہ انکے فرزند کچھی رام کو وراثت میں تفویض کیا گیا۔ جو صلابت جنگ کے عہد تک امور انجام دیتے رہے۔ کچھی رام کے پانچ فرزند تھے۔ ان میں سب سے بڑے نانک رام تھے۔ ان سے چھوٹے شاداں کے والد ماجد نراین داس تھے۔ رائے نانک رام کی وفات کے بعد انکے خاندان کا حال ابتر ہو گیا۔ راجہ چندو لعل مجبور ہوئے کہ ملازمت کی تلاش کریں۔ چنانچہ وہ شمیر جنگ اور بدیع اللہ خان کمشنر کروڑگیری کی ماتحتی میں کام کرنے لگے۔ جب نور محمد کمشنر کا زمانہ آیا تو راجہ صاحب کو سبزی منڈی کی محرری پر مقرر کیا گیا۔ وہ صبح سے شام تک منڈی میں بیٹھے رہتے۔ سخاوت اور غربا پروری کا یہ عالم تھا کہ جب منڈی سے واپس لوٹتے تو غریبوں کو پیسہ تقسیم کرتے ہوئے گھر آتے۔ ان کی اس بے نظیر فیاضی نے بہت جلد ان کو بڑے مرتبے پر پہونچا دیا۔ جب حضرت بخشی بیگم صاحبہ غفران مآب کے بڑے محل نے راجہ صاحب

---

[۱] بہادر چندو لعل، کلیات شاداں اردو، محبوب پریس، حیدرآباد، دکن، ص ۳۔۵

کو بیلی کا کام سونپا۔ اس کے بعد راجہ چندو لعل کی ترقی کا دور شروع ہو گیا۔ شمیر جنگ بہادر نے حضور نظام سے عرض کر کے ان کو تعلقہ موروثی کی کارپردازی پر مقرر کرادیا اور جب راجہ لکھپت رائے ابن نانک رام کا انتقال ہوا تو ان کو کمشنری کروڑ گیری کا عہدہ دے دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ سوم نے انکی قابلیت کو دیکھ کر آصفیہ فوج کا پیشکار مقرر کر دیا۔ ۱۲۳۵ھ میں راجہ بہادر چندو لعل کی قسمت کا ستارہ اور بلند ہوا تو آصف جاہ سوم نے مہاراجہ اور بہادر کا خطاب دے کر نوبت اور جھالر دار پالکی سے سرفراز فرمایا اور انکی دریادلی سے واقف ہو کر ایک کروڑ روپیہ نقد انعام سے نوازا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۲۳۷ء میں صاحبزادہ مبارز الدولہ بہادر کی مراجعت پر ہفت ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ نواب ناصر الدولہ کے عہد میں چندو لعل کو راجہ راجایان کا خطاب دیا گیا اور ان کے ذمہ جو قرض تھا۔ وہ سب معاف کر دیا گیا۔ ۱۲۴۸ھ میں وزیر اعظم منیر الملک بہادر کے انتقال کے بعد مہاراجہ چندو لعل بہادر وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ مختصر یہ کہ مہاراجہ چندو لعل اپنی بے نظیر قابلیت سے معمولی درجہ کی ملازمت سے اعلیٰ مقام تک پہونچ گئے۔ (۲)

این سعادت بہ زور بازو نیست تا نہ بخشد خدای بخشندہ

۱۲۶۰ھ میں وہ ملازمت سے سبدوش ہوئے اور ایک سال بعد ۶۸ برس کی عمر میں فرخندہ بنیاد حیدرآباد دکن میں انتقال کر گئے۔

مہاراجہ بہادر غیر معمولی اخلاق و اطوار اور بے نظیر سخاوت کے مالک تھے۔ امیر و غریب کے متعلق انکا برتاو صلح کل کا رنگ لئے ہوئے تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز، عالم اور اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور شاداں تخلص تھا۔ علما اور ادبا کے قدر شناس تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے نامور شاعر خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی اور امام بخش ناسخ لکھنوی کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن ان شعراء نے کسی سبب سے آنے سے انکار کر دیا۔ ذوقؔ نے ایک غزل اس سلسلے سے کہی جس کا آخری شعر یہ ہے:

(۲) ثمینہ شوکت ڈاکٹر، مہاراجہ چندو لعل شاداں، حیات اور کارنامے، نیشنل پریس، چار کمان، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۳ء، ص ۵۵-۸۰؛ کلیات شاداں اردو، ص ۵-۹

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر [۳]

راجہ صاحب نے ہم عصر علماء اور شعرا کی ایک بڑی جماعت اپنے پاس جمع کرلی تھی جس میں ان کے چھوٹے بھائی گووند بخش ضیائیؔ، میر امجد علی خان، ملا محمد فائض کاشانی، میرزا ابوالفیض بیگ افشار، ذوالفقار علی صفاؔ، ملک الشعراء شیخ محمد حفیظ دہلوی اور معروف شاعر شاہ نصیر دہلوی وغیرہ تھے۔ مہاراجہ صاحب کا معمول تھا کہ وہ ہر رات خاصا وقت اہل علم وادب کی صحبت میں شعر وسخن، تصوف اور علمی مسائل پر گفتگو کرنے میں صرف کرتے تھے۔ مہاراجہ کا کلام ان کے جذبات واحساسات اور خیالات کا آئینہ دار ہے۔ ان کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خیالات سادہ طور سے موزوں کردیے گئے۔ جو دل میں تھا وہ زبان پر آگیا۔ کلیات کو دیکھا جائے تو ہر جگہ تصوف کا رنگ غالب ہے۔ مہاراجہ چندو لعلؔ کی شاعری کی شہرت حیدرآباد سے باہر بھی پھیل گئی۔ اردو کے مقابلے ان کی فارسی شاعری زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔ حالانکہ وہ فارسی کے عمدہ سخنور تھے۔ ان کے فارسی کے تین دیوان دستیاب ہیں۔ پہلا حیدرآباد میوزیم میں دوسرا کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی (او۔ ایم۔ ایل) اور تیسرا عشرت کدہ آفاق ہیں۔ پہلے دو دیوان یکجا کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہیں۔ ان کے تینوں دیوانوں میں غزلوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ فارسی شاعری کا ذوق خاندانی اور روایتی تھا۔ ان کا تعلق زیادہ تر سکندر جاہ سے رہا اس لیے اردو اور فارسی میں سکندر جاہ ہی کی مدح ملتی ہے۔ ارسطو جاہ اور میر عالم کے زمانہ سے حیدرآباد کی ادبی اور سماجی زندگی پر ایرانی اثرات غالب تھے۔ خود چندو لعل کے دربار میں ایرانی شعرا کی کمی نہیں تھی۔ جن کی وہ سرپرستی اور قدردانی کرتے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے شاداں کی فارسی شاعری کا ذوق ابھرا اور خوب نکھرا اور فارسی غزل میں بلاشبہ خاصی دستگاہ حاصل ہوگئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے اساتذہ کا وسیع مطالعہ کیا تھا پھر فارسی غزل ان کے ذوق اور وجدان سے بھی گہری مناسبت رکھتی تھی۔ ان کی اکثر غزلیں اساتذہ کی غزلوں کے جواب میں لکھی گئیں۔ شاداں کی مثنوی کے دیباچہ نگار نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

”از ان جملہ کتب دیوان شعر است کہ در جواب اشعار آبدار اساتذہ سلف فرمودہ اند۔“[۴]

---

[۳] ثمینہ شوکت ڈاکٹر، مہاراجہ چندو لعل شاداں، حیات اور کارنامے، ص ۵۷۰-۵۷۴

[۴] مہاراجہ چندو لعل شاداں، حیات اور کارنامے، ص ۶۸۴

شاداں نے جن مشاہیر اساتذہ سے شعری استفادہ کیا ان میں سنائی، نظامی، رومی، سعدی، حافظ، جامی اور انوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر وہ حافظ سے اتنے متاثر تھے کہ عموماً انہیں کی منتخب غزلوں پر طبع آزمائی کی۔ مثنوی شاداں کا دیباچہ نگار لکھتا ہے:

"اکثر اشعار والا در جواب اشعار خواجہ شیر ازی است"[۵]

شاداں نے ان برگزیدہ اساتذہ شعراء کی عظمت کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا جیسا کہ اس شعر سے واضح ہے۔

حافظ و جامی وسعدی و نظامی مولوی   پادشاہان سخن در ملک اشعار آمدہ

حافظ کے علاوہ انوری اور سنائی سے بھی انہیں ارادت تھی۔ ان دونوں اساتذہ کا ذکر وہ ایک شعر میں اس طرح کرتے ہیں:

بہ چہ حسن جلوہ کردی کہ ہمہ اسیر گشتند   بہ سخن چگونہ وصفت کند انوری سنائی

شاداں نے رومی سے بھی اکتساب کیا تھا۔ یہاں ان کی ایک غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ جو رومی کی مشہور غزل:

آنانکہ بر براق بصیرت سفر کنند   بی ابر وبی غبار در آن مہ نظر کنند

کے جواب میں لکھی ہے لیکن اسکا قافیہ بدلا ہوا ہے۔

گر دوستان مرا بہ صنم روبرو کنند   منت ہزار بار کہ کار نکو کنند

سعدی کی سادگی کا بھی شاداں پر بہت اثر تھا۔ انہوں نے سعدی کی زمینوں میں بھی کئی غزلیں لکھیں ہیں اور کئی جگہ ان کے مصرعوں کی تضمین بھی کی ہے۔ ایک تضمین درج کی جاتی ہے۔

قول سعدی بود این نکتہ چہ خوش فرمودہ است   راہ گر راست نباشد خطری نیست کہ نیست

شاداں کی ذیل کی غزل کے یہ اشعار:

جانم چو بہ روی تو نثار است   زانروست کہ روی من بہار است
دور است کسی کہ دور ببین است   معشوقہ ہمیشہ در کنار است

سعدی کی غزل کے اس شعر سے متاثر نظر آتے ہیں:

فریاد من از فراق یار است   وافغان من از غم فگار است

---

(۵) ماخذ سابق، ص ۶۸۶

ان کی اور غزلوں میں بھی سعدی کا جلوہ نمایاں ہے۔ایک غزل سعدی کی زمین میں ہے جس کے دو شعر بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں:

من مبتلای او یم ای دوستان خدارا رازدلی کہ دارم خواہد شد آشکارا
یک لحظہ دوری او صد سال می نماند شادان کہ گوئدت حال آن یار آشنارا

جامی کے انداز تغزل میں جو جاذبیت تھی۔اس نے بھی شاداں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔چنانچہ جامی کی اکثر غزلوں کی زمین میں شاداں کی غزلیں ملتی ہیں۔جامی کی غزل کے اس شعر:

ای ترک شوخ این ہمہ نازوعتاب چیست بادل شکستگان ستم بی حساب چیست

کے ساتھ،شاداں کے یہ اشعار:

بہتر زیاد صورت آن گلعذار چیست جانا بیا کہ منتظرم انتظار چیست
ابر است وسبز ہ زار ورواں آب جوئبار جانم فدات خوشتر ازین نو بہار چیست

دیکھتے ہیں تو ان کے ذوق سخن اور شاعرانہ مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔حافظ کی بھی ایک غزل اسی زمین میں ہے۔شاداں کی ایک اور غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل را طواف کن کہ شدی رستگار تو من فاش گفتی بہ ازین قبلہ گاہ کیست
شاداں تو شاد باش کہ دلدار می رسد پابرسرم نہادکہ این جلوہ گاہ کیست

بیدل کی بدیع الاسلوبی اور معنی آفرینی کا اثر ان کے زمانے کے اکثر فارسی گو شعرا پر بہت گہرا تھا۔غالب کا ذکر اس سلسلے میں مثال کے طور پر کیا جاتا ہے۔شاداں کو بیدل کی بدیع الاسلوبی پر پوری دسترس حاصل نہیں تھی۔لیکن انکی بعض مشہور اور دلکش غزلوں پر شاداں نے بھی غزلیں کہی تھیں۔ذیل میں ایک غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

چہ نوشت محفل ماشبی تو بہ روی ہمچو سمن درا رودآب وتاب چمن ہمہ تو بہ جلوہ غنچہ دہن درا
اگراین تراہوسی بود کہ بہ سیر سوی چمن روی بہ ازانکہ سیر چمن کنی زکرم بہ جانب من درا
نظری بہ جانب من نماشدہ ام بہ روی تومبتلا دردل کہ خانہ بود ترا بکشاد می بہ وطن درا

اسی غزل میں چندو لعل شاداں کا جذبہ حب الوطن بھی ابھر آتا ہے۔اور وہ یہ کہہ اٹھتے ہیں:

ہوسی اگر بہ دلت بود کہ بہ سوئی ملک دگر روی بگذرازین کہ خطر بود تو بہ سوئی ملک دکن درا

ایک اور شعر میں انہوں نے حیدرآباد دکن کی تعریف اس طرح کی:

صفا ونزہت اورا کجا رسد کشمیر که رشک گلشن فردوس حیدرآباد است[۶]

واقعہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے فارسی کے تقریباً تمام اساتذہ سے استفادہ کیا تھا۔ اور ان کے ذوق غزل گوئی نے سب ہی سے رس لیا تھا۔ چندو لعل کی رومی سے عقیدت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے روحانی اساتذہ میں شامل تھے۔ فارسی شاعری میں شاداں کے دو بڑے سرچشمہ اکتساب تھے۔ غزل میں حافظ اور مثنوی میں مولانا رومی، چندو لعل نے مثنوی معنوی کے تتبع میں اور اسی بحر میں مثنوی لکھنا شروع کیا جس کا آغاز حمد الٰہی سے ہوتا ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

حمد آن پروردگار دوجہان قرص مہر وماہ را کردہ عیان

اس کے بعد مناجات اور حکایتیں اور متصوفانہ پہلوؤں کی تشریح ہے۔ یہ مثنوی اپنے مطالب کے لحاظ سے خاص طور پر اہم ہے۔ اس مثنوی کا اختتام ایک انکسارانہ جذبہ کے ساتھ اس شعر پر ہوتا ہے:

یاالٰہی فضل گردان بر غلام کززبان مولوی گفتم کلام

دوسری مثنوی جو بوستان سعدی کے انداز اور اس کی بحر میں لکھی گئی ہے اس کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔

سپاس خداوند جان آفرین که باشد خدای زمان وزمین

بیک حرف کن خلق پیدا نمود نبود آن چہ پیدا ہویدا نمود

اس کے بعد مناجات، نعت اور منقبت ہے۔ اور سکندر جاہ کی مدح میں اکیس اشعار لکھے ہیں۔ اس مثنوی میں پند ونصیحت، کرم وسخاوت، مسافر نوازی اور بادشاہوں کے کردار کے بہت سے نکات درج کیے گئے ہیں۔ شاداں نے کل چھ قصیدے لکھے ہیں۔ ان میں پہلا حمدیہ قصیدہ ہے۔ اور دو نعتیہ قصیدے ہیں۔ اور باقی تین قصیدے نواب سکندر جاہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ بعض قصاید کے مطلع کے شعر یوں ہیں:

آنکہ این چون بحر اندر موج بود این زمین وآسمان پیدا نمود

شاہ مامی دہد بہ شاہان تاج ہر امیر و گدا بہ او محتاج

تراسزدبہ سرداران گزاری تاج بہ جود وبخشش تو عالمی بود محتاج

شاداں قصیدے میں اس فن کے اساتذہ عرفی شیرازی اور انوری وغیرہ کے معیار تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی فارسی گو شعرا کی طرح محاورہ سے تجاوز کی مثالیں ان کے

---

(۶) ماخذ سابق، ص ۶۸۸

یہاں بھی ملتی ہیں۔ مخمس اور ترجیع بند بھی شاداں نے لکھے تھے۔ انہوں نے اس میں عاشقانہ اور متصوفانہ جذب و مستی جیسے نکات کا استعمال کیا ہے۔ شاداں کی کل ۱۲۹ رباعیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں سے ان کے دوسرے دیوان میں ۱۰۷ اور تیسرے میں ۲۲ رباعیاں شامل ہیں۔ رباعیوں میں عموماً تصوف، حکمت و دانش اور وعظ و نصیحت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ حسن و عشق کے جذبات بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شاداں نے سرمدؔ شہید سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ ان کی بعض رباعیوں میں سرمدؔ شہید کے مخصوص انداز کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک رباعی ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔[۷]

جانا نہ خود کہ فرد اول باشد دارد بہ نظر ہر آنکہ اکمل باشد
چون نیست دوئی بذات واحد شادان گر دو نگرد دیدہ احول باشد

اس رباعی میں وہ وحدت الوجود کے مسئلہ کو پیش کرتے ہیں:

از چشم نہانی وترا می بینم واللہ چہ گویم کہ جہان می بینم
خورشید زپرتوش بودیک ذرہ در جملہ جہان نور خدا می بینم

شاداں نے چار قطعے لکھے تھے۔ دو قطعے سکندر جاہ کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ ایک قطعہ ان کی سواری کی تعریف میں دوسرا جشن راکھی کے موقع پر کہا گیا ہے۔ جشن راکھی کا قطعہ ذیل میں درج ہے:

شاہ دوران ما سکندر جاہ رتبہ دارد فزون زمہر و ماہ
جشن راکی بہ او مبارکباد بر لبانم دعا ست شام وپگاہ

عشرت کدہ آفاق شاداں کی شہرہ آفاق فارسی تصنیف ہے۔ جو تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں خانوادہ آصفیہ اور شاداں کے آباواجداد کے احوال ہیں۔ دوسرے باب میں شاداں کی منتخب غزلیات اور رباعیات اور وہ قصیدے جو ان کے متعلق ان کے عہد کے شعرا نے لکھے تھے۔ اور تیسرا باب حکایات اور نکات پر مشتمل ہے شاداں نے اس میں سعدیؔ کی پیروی کی ہے۔ یہ کتاب راجہ سرکشن پرشاد شادؔ کے حکم سے ۱۳۲۵ھ میں محبوب پریس، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ شاداں کے اردو کے دونوں دیوان محبوب پریس، حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں۔[۸]

---

(۷) ماخذ سابق، ص ۱۰۷-۲۰۷

(۸) بہادر چندو لعل، عشرت کدہ آفاق، محبوب پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۵ھ، ص ۸

خطباتِ سر سید کی بازیافت نو

نعمان بدر فلاحی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
nomanbadaralig@gmail.com

علی گڑھ تحریک کے بانی اور محسن قوم و ملت سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) کے لکچرز اور خطبات کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ ان کی حیات میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ الہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار *The Pioneer* نے سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں سر سید کے پانچ خطبات اور خطوط کو انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ بعد ازاں منشی سراج الدین احمد نے سر سید کے تقریباً ۴۰ لکچرز کا مجموعہ ۱۸۹۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۹۲ء میں ہلالی پریس، انبالہ سے شائع ہوا جس میں پانچ مزید لکچرز شامل کیے گئے۔ سید والا گہر کی وفات کے معاً بعد محمد امام الدین گجراتی نے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۸ء کے دوران دیے گئے سید کے ۸۰ خطبات کا مجموعہ ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔ مندرجہ بالا تمام مجموعے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہیں۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (۱۸۹۳ء - ۱۹۷۲ء) نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے لاہور میں بیٹھ کر سید احمد خاں کے ۹۸ خطبات کو "خطبات سر سید" کے عنوان سے ۲ جلدوں میں ۱۹۷۳ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اسماعیل پانی پتی نے ۱۶ جلدوں میں "مقالات سر سید" اور ۲ جلدوں میں "مکاتیب سر سید" بھی مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کی تھی۔ اسماعیل پانی پتی کا یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ علی گڑھ آئے بغیر اور سر سید اور ان کے عہد سے زمانی اور مکانی فاصلے کے باوجود نہ صرف یہ کہ اصل مصادر سے استفادہ کی راہ نکالی اور اس مقصد کے لیے زر کثیر خرچ کیا، بلکہ انہوں نے سر سید شناسی اور علی گڑھ تحریک کے بنیادی سر چشمے سے علمی دنیا کو متعارف کرایا۔[۱]

---

[۱] عطا خورشید (مرتب)، کلیات خطبات سر سید، ناشر اکسٹرا آرڈنری لائف میڈیا، لکھنؤ ۲۰۲۲ء، جلد اول صفحہ ۲۱- ۲۲۔

سرسید اکیڈمی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر شان محمد نے پہلے سرسید کے ۱۸ مختلف لکچرز کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۲ء میں بمبئی سے شائع کیا، پھر ان کے مختلف مضامین کا انگریزی ترجمہ تین جلدوں میں ۱۹۷۸ء میں میرٹھ سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ سرسید اکیڈمی نے ۲۰۰۵ء میں ان کے گیارہ اردو خطبات کے انگریزی ترجمہ پر مشتمل ایک مجموعہ *Selected Lectures of Sir Syed Ahmad* کے عنوان سے شائع کیا۔

سرسید کے اردو خطبات، لکچرز اور مضامین وغیرہ کے مذکورہ بالا تمام مجموعوں میں اسماعیل پانی پتی کی تالیف "خطبات سرسید" کو بالعموم اہل علم حتمی اور مکمل خیال کرتے رہے مگر اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی بوسیدہ فائلوں کی ورق گردانی اور تلاش و جستجو کی توفیق تقریباً ایک صدی کے بعد کسی دانشور اور محقق کو ہوئی جس نے بڑی عرق ریزی اور جاں گسل جدوجہد کے بعد اسماعیل پانی پتی کے دریافت کردہ ۹۸ خطبات کے علاوہ مزید ۱۰۴ خطبات ڈھونڈ نکالے۔ یہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں سینئر اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر عطا خورشید کا کارنامہ ہے جن کے نو دریافت شدہ خطبات یقیناً علی گڑھ تحریک کے بنیادی خطوط اور مطالعات سرسید کے باب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہیں۔

'کلیات خطبات سرسید' کے عنوان سے ڈاکٹر عطا خورشید کی تحقیقات ۳ جلدوں میں تقریباً ۱۴ سو صفحات پر مشتمل ایک وقیع تاریخی اور علمی دستاویز ہے جس کے بغیر مدرسۃ العلوم، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عروج واقبال کی داستان اور روداد سفر مکمل نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر عطا خورشید کی مرتب کردہ اس کلیات میں سرسید کے ۲۰۲ خطبات اور تقریروں کو زمانی ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں مرتب لکھتے ہیں:

> اسماعیل پانی پتی کی مرتبہ تالیف کے علاوہ جو بھی خطبے میں نے دریافت کیے انہیں نو دریافت شدہ خطبہ قرار دیا ہے۔ میں نے حتی الامکان بنیادی مآخذ کا استعمال کیا ہے۔ ثانوی مآخذ کا سہارا اس وقت لیا ہے جب سرسید کی اشاعت میں یہ چیزیں دستیاب نہ ہوسکیں، جن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ میرے ثانوی مآخذ میں منشی محمد سراج الدین کا مرتبہ "لکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری" (لاہور، ۱۸۹۰ء) اور مولوی محمد امام الدین گجراتی کا مرتبہ "مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز" (لاہور، ۱۹۰۰ء) ہیں۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی انہی دونوں مجموعوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے بیشتر خطبات محولہ بالا دونوں مجموعوں سے اخذ کیے ہیں۔ ان کی

رسائی 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی' اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' تک نہیں ہو سکی۔ ہم نے بنیادی مآخذ میں دیے گئے عنوانات کو ہی بحال رکھا ہے، عنوانات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، نیز ان تمام خطبات کی ترتیب زمانی رکھی ہے۔اسماعیل پانی پتی کے مرتبہ 'خطبات سر سید' میں موجود خطبات کے علاوہ جو نو دریافت شدہ خطبات ہم نے اس میں شامل کیے ہیں، ان پر شناخت کے لیے نشان (خ) لگا دیا گیا ہے۔ یہ نشانات فہرست میں بھی ہیں اور متن کے عنوان پر بھی دیے گئے ہیں۔ بنیادی مآخذ سے مدد لینے میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسماعیل پانی پتی کی ترتیب میں جو غلطیاں مثلاً تاریخ اور سنین کی راہ پا گئی تھیں، ان کی بھی تصحیح کر دی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان نئے دریافت شدہ خطبات سے سر سید کی فکر کو تلاش کرنے میں ایک نئی جہت ملے گی اور علی گڑھ تحریک کی تحقیق میں محققین کو کچھ نئے زاویے ملیں گے۔[۲]

۴۶۲ صفحات پر مشتمل کتاب کی جلد اول میں ۶۳ خطبے شامل ہیں، جن میں ۴۱ نو دریافت شدہ ہیں۔ پہلا خطبہ سر سید کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے ۵/ نومبر ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں ایک مدرسے کی رسم سنگ بنیاد کے موقع پر کی تھی۔ یہ سر سید کی دستیاب شدہ تقریروں میں دوسری تقریر ہے جس میں وہ تعلیم کے میدان میں قوم کی ابتر صورت حال پر شکوہ کناں ہیں اور ہر بڑے شہر اور قصبے میں مدرسے قائم کرنے کی تاکید کر رہے ہیں۔اسی تقریر میں سر سید مراد آباد میں ایک فارسی مدرسے کے قیام کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اور ساتھ ہی درجہ اول سے درجہ ہفتم تک کا فارسی نصاب تعلیم بھی تجویز کر رہے ہیں۔ اس موقع پر سر سید نے ایک کتابچہ بھی تقسیم کیا تھا جس میں ان کی تقریر شامل تھی۔ شعبۂ اردو کے سابق استاذ مرحوم پروفیسر اصغر عباس (۹/ اکتوبر ۱۹۴۱ء- ۷/ ستمبر ۲۰۲۲ء) نے اسی کتابچہ کی روشنی میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ کے شمارہ نمبر ۲۰۵ (جولائی- ستمبر ۲۰۲۱ء) میں شائع ہوا ہے۔

جلد اول کا دوسرا خطاب زمانی ترتیب کے اعتبار سے سر سید کی دستیاب تقریروں میں پہلے نمبر پر ہونی چاہیے۔ یہ خطاب "غدر" کے ہنگاموں کے رفع ہو جانے کے بعد امن و امان کے قیام کے لیے ۲۸/ جولائی ۱۸۵۹ء میں درگاہ شاہ بلاقی، مراد آباد کی مسجد میں تقریباً پندرہ ہزار کے مجمع کے سامنے سر سید کی ایک مناجات ہے جو انھوں نے مسجد کے صحن میں ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر پڑھی تھی۔

جلد اول کا آخری خطبہ بھی سر سید کی مراد آباد میں کی گئی ایک تقریر ہے جو ۳۰/ مارچ ۱۸۸۰ء

---

[۲] ماخذ سابق، ص ۲۴۔

کو ۹ بجے شب میں مدرسۃ العلوم کے چندے کے لیے منعقد ایک جلسے میں کی گئی تھی۔ جلسے میں جج مسٹر ینگ، کلکٹر و مجسٹریٹ مسٹر ٹریسی، اسسٹنٹ مجسٹریٹ مسٹر کروک، پولیس سپرنٹنڈنٹ میجر کنٹر کے علاوہ مولوی سمیع اللہ خاں، بابو مادھو داس اور بابو کالی پرسنو صاحبان نے بھی خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۲۰/اپریل ۱۸۸۰ء کو شائع ہوئی ہے۔

خطبہ نمبر ۴۸، سر سید کا وہ خطاب ہے جو انھوں نے ۱۱/ جولائی ۱۸۷۴ء کو مشرقی اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں مسلمانوں کی انجمن اور رئیسوں کے سامنے میں مدرسۃ العلوم کے چندے کے لیے منعقد جلسے میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ سائنٹفک سوسائٹی کے مختلف جلسوں اور پروگراموں نیز مدرسۃ العلوم کی ترقی کے لئے منعقد ہونے والے متعدد جلسوں میں ان کی تقاریر ہیں جو سب کی سب نہایت بیش قیمت ہیں۔

'کلیات خطبات سر سید' کی دوسری جلد بھی ۴۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۶۷ خطبات شامل ہیں۔ ۲۷ خطبات نو دریافت شدہ ہیں۔ پہلا خطاب کالج کے اولین بورڈنگ ہاؤس کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر ۶ نومبر ۱۸۸۰ء کو بورڈنگ ہاؤس کے منیجر مولوی محمد اکبر کی جانب سے منعقد ایک ٹی پارٹی کے موقع پر سید کی تقریر ہے جس میں ان کی خاکساری، انکساری اور تواضع نمایاں ہے۔ تقریر کے دوران انھوں نے بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے لیے اپنے رفیق کار مولوی سمیع اللہ کی کاوش اور جدو جہد کی دل کھول کر تحسین کی ہے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم بچوں کے اعلیٰ اخلاق، بلند کردار، ہمہ جہتی صلاحیتوں اور دین داری کی کیفیت پر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کی جلد دوم میں مدرسۃ العلوم کے پہلے سالانہ جلسے میں سر سید کے تقریر کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں مثلاً لدھیانہ، امرتسر، گورداسپور، جالندھر اور صوبہ گجرات میں ان کی تقریریں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جلد دوم میں سر سید کے سیاسی تصورات کو ظاہر کرنے والی دو اہم تقریریں بعنوان 'پولیٹیکل امور اور مسلمان' نیز 'سیاست اور ہم' بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ فروری ۱۸۸۴ء میں قیام لاہور کے دوران ہندو تحریک 'آریا سماج' کے ممتاز افراد کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران سر سید نے جو خطاب کیا ہے، اس سے ہندوؤں کے ساتھ ان کے تعلقات اور ان کے سلسلے میں سید صاحب کے نظریات اور خیالات کی تفسیر ہوتی ہے ۔ اسی جلد میں خطاب نمبر ۹۶، دراصل ۳/ فروری ۱۸۸۴ء کو انڈین اسوسی ایشن لاہور کی جانب سے گورنمنٹ اسکول لاہور میں سر سید کی وہ تقریر ہے جس میں انھوں نے کہا تھا: "میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے

سمجھتا ہوں"۔

۴۶۲ صفحات پر مشتمل کلیات کی تیسری جلد میں سید احمد خاں کے ۲۷ خطابات ہیں جن میں ۳۵ نو دریافت شدہ ہیں۔ پہلا خطاب مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق میرٹھ میں کی گئی ان کی ایک تقریر ہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۲۲ مئی ۱۸۸۸ء کو شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں سید صاحب نے ایک عربی شعر نقل کیا ہے جو اس زمانے میں مسلمانوں کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعے کا آخری خطاب ۳/ جنوری ۱۸۹۸ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ کے ٹرسٹیان کے اجلاس میں سر سید کی آخری تقریر ہے جس میں فلسفے کے پروفیسر آرنلڈ کی ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کے مطالبے پر سر سید نے اپنی رائے پیش کی ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر آرنلڈ کی ماہانہ تنخواہ اس وقت پانچ سو روپیہ تھی جسے چھ سو روپیہ ماہوار کر دیا گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ علی گڑھ چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے تھے۔

اس کے علاوہ 'کلیات خطاب سر سید' کی تیسری جلد میں تعلیم نسواں، اوقاف کے مسائل، فارسی اور عربی زبان کی تعلیم، مسلمانوں کی مذہبی تعلیم، طب یونانی کی ترقی، انگریزی تعلیم کے نتائج بد سے اجتناب، درسی کتابوں، اسکالرشپس اور علی گڑھ کالج سے متعلق موضوعات پر سر سید احمد خاں کی متعدد تقریریں موجود ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا تینوں کتابوں کا انگریزی ترجمہ حال ہی میں ' نوشن پریس ڈاٹ کام' (چنئی) نے شائع کر دیا ہے۔ میری لینڈ، امریکہ میں مقیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم عارف انصاری نے 'کلیات خطاب سر سید' کو انگریزی کا پیرہن عطا کیا ہے۔

بانیٔ درس گاہ سر سید احمد خاں کے علمی و ادبی سرمایے، ان کے مقالات، مضامین، رسائل، خطبات اور خطوط وغیرہ کی تلاش اور از سر نو اشاعت کی ہر کوشش یقینی طور پر ایک مبارک اور مستحسن قدم ہے۔ گو سر سید ہاؤس میں قائم 'سر سید اکیڈمی' کے اندر اس سلسلے میں مختلف پروجکٹس پر کام ہو رہا ہے، مگر ذاتی دلچسپی، اور اپنے فطری میلان و رجحان کے بغیر کامیابی آسانی سے نہیں ملتی ہے اور کوششیں نتیجہ خیز نہیں ہوتی ہیں۔

تقریباً ۱۲۵ برس کے بعد سر سید کے گمشدہ خطبات کی از سر نو بازیافت ڈاکٹر عطا خورشید کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ ہے مگر شہر علم (علی گڑھ) کے علاوہ علم و ادب کی دنیا میں چہار جانب سناٹوں کی حکمرانی ہے۔

وقف کے نئے قانون کے بعد ہمارا لائحۂ عمل

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

مئی ۲۰۱۴ میں بی جے پی کے اقتدار اعلیٰ پر پارلیمانی اکثریت کی بنیاد پر قبضے کے بعد ملت کے ساتھ اس کا جو سلوک ہے اور جس طرح یکے بعد دیگرے معاملات میں من مانی دخل اندازی کی جارہی ہے اور قانون کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، اس سے ملت کے قائدین کو اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ اب حکومت کے لئے کوئی حد ایسی نہیں ہے جس کو وہ پار نہ کرسکے۔ اگر اس نے ابتک کچھ نہیں کیا ہے تو وہ غیر مسلمین اور بالخصوص خارجی دنیا کے ردعمل کے ڈر سے نہیں کیا ہے کیونکہ مغربی میڈیا اور ادارے اب یہ کہنے لگے ہیں کہ ہندوستان جمہوری (ڈیموکریسی) ملک نہیں رہ گیا ہے بلکہ وہاں صرف شکلی طور سے الیکشن ہوتے ہیں جبکہ غیر ہندوؤں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ یہ بات ہندوستان کی دنیا میں شبیہ اور اس سے ملنے والے بے شمار فوائد کے لئے مضر ہے۔

بی جے پی حکومت نے مدرسوں، مسجدوں، مقبروں اور درگاہوں وغیرہ کے خلاف مہم چھیڑی، احتجاج کرنے والوں کے ہزاروں گھر بلڈوز کئے، ذرا ذرا سی بات پر سخت سے سخت دفعات لگا کر ہزاروں کو جیل بھیجا گیا اور ہم خاموش رہے۔ اسی طرح اکیسویں صدی کے پہلے دہے میں جعلی دہشت گردی کے نام پر ہمارے ہزاروں نوجوانوں کو قتل یا جیل رسید کیا گیا اور برسوں بعد ہم بیدار ہوئے تو "اسلام دہشت گردی کی تایید نہیں کرتا" کے عنوان سے کانفرنسیں منعقد کرنے لگے اور فتوے دینے لگے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جو اشخاص اور تنظیمیں مسلمانوں کی قیادت کا دم بھرتی ہیں، وہ قیادت کا حق ادا نہیں کرتیں۔ ان کے پاس حاضر کا پورا ادراک اور مستقبل کا واضح تصور (وژن) نہیں ہے۔ قیادت کا مطالبہ ہوتا ہے کہ آفت آنے سے پہلے اس کا سدّباب کر لیا جائے اور اگر آہی جائے تو کم سے کم نقصان اٹھا کر اپنی قوم کو اس سے نجات دلائی جائے۔ اس کے لئے ایسی قیادت لازمی ہے جو حالات سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس کے پاس ایسا تھنک ٹینک موجود ہو جو بے لاگ طریقے سے معلومات اکھٹا کرے اور حالات کا صحیح تجزیہ کرکے قیادت اور قوم کو باخبر کرے تاکہ صحیح اقدامات کسی مصیبت

کو روکنے یا اس سے بچنے کے لئے کئے جا سکیں۔

بی جے پی، آر ایس ایس اور ہندوتوا کی طاقتوں کا ایجنڈا برسوں سے طے ہے۔ پہلے ان کے کچھ غیر اہم لوگ مسائل کو اٹھاتے ہیں، پھر دھیرے دھیرے وہ پوری تحریک کا اصل مسئلہ بن جاتا تھا اور پھر جب حالات تیار ہو جاتے ہیں تو حکومت اپنا کام کرتی ہے۔

اوقاف کے بارے میں برسوں سے پروپیگنڈا چل رہا تھا کہ یہ جعلی ہیں، وقف بورڈوں نے زبردستی زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے، قدیم مساجد اور درگاہیں دراصل مندروں کے ملبے پر بنائی گئی ہیں وغیرہ۔۔۔ ایسی حالت میں اپنا کیس ٹھیک سے تیار کر کے رائے عامہ اور حکومت کے پاس جانا چاہئے تھا اور ضرورت محسوس ہوتی تو آنے والے طوفان کو روکنے کے لئے کورٹ بھی جانا چاہئے تھا۔ یہی نہیں بلکہ ضرورت محسوس ہوتی تو اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن اور حقوق انسانی کی تنظیموں تک اپنی بات پہچانی چاہئے تھی۔ یہ سب ہمارے یہاں بالکل نہیں ہوا۔ جب پل ٹوٹنے لگا تو ایمیل بھجوائے جانے لگے اور اب بغیر تیاری کے لوگ سپریم کورٹ بھاگ رہے ہیں۔ ادھر قانون پاس ہوا، اور چند دنوں میں لوگ سپریم کورٹ پہنچ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ گہری تیاری نہیں کی گئی ہے بلکہ اخبارات میں خبر چھپوانے اور اپنے مویدین کو دکھانے کے لئے بھاگ دوڑ ہے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں، گھبراؤ نہیں۔

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ عوام احتجاج کریں، "شاہین باغ" دوبارہ کھڑا کریں۔ اگر قائد لوگ اس کی قیادت کریں تو ٹھیک ہے ورنہ ناسمجھ بھیڑ کو کٹنے کے لئے بھیجنا کون سی عقلمندی ہے؟ پھر نمبروں کی لڑائی میں آپ کیسے جیتیں گے؟ اگر آپ ۱۵ سڑک پر لائیں گے تو وہ ۸۰ لائیں گے۔ پھر پولیس اور انتظامیہ ان کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کی ہڈیاں توڑی جائیں گی، گھر بلڈوز کئے جائیں گے اور جیلیں بھری جائیں گی جبکہ قائد حضرات خوش اسلوبی سے بچ کر نکل جائیں گے۔۔۔۔ یہ کون سی قیادت ہے جو اپنے پیادوں کو جنگ میں جھونک کر اپنے لئے گوشۂ عافیت تلاش کر لیتی ہے۔ اس وقت خوب اچھی طرح تیاری کر کے، عمدہ وکیلوں کے ذریعے سپریم کورٹ کا رخ کرنا چاہئے۔ سڑک پر آنے سے گریز کرنا چاہئے اور اگر آنا ہی ہے تو قائد حضرات صف اول میں کھڑے ہوں اور گرفتاریاں دیں۔

قانون بن جانے کے بعد اس کا فوری نفاذ بھی شروع ہو گیا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک موجودہ حکومت باقی ہے۔ افق پر امیدوں کے بادل دکھا رہے ہیں کہ یہ صورت

حال چار سال بعد بدلے گی اور جب دوسری حکومت آئے گی تو اس ظالم قانون کو ختم کر دیا جائے گا۔ ایسا ہونے کا پورا امکان ہے۔ اگر اپوزیشن والے آپس میں لڑنے کی حماقت نہ کریں تو اگلے عمومی الیکشن میں ہندوتوا کی پسپائی یقینی ہے۔ ابھی سے اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ ربط رکھا جائے اور کوشش ہو کہ تمام اپوزیشن پارٹیاں اپنے آنے والے انتخابی منشور میں لکھیں کہ جیتنے اور حکومت بنانے کے بعد وہ یہ ظالم قانون ختم کر دیں گی اور اقلیتوں کے لئے بنائی گئی ساری اسکیمیں، جن کو بی جے پی حکومت نے ختم یا بہت محدود کر دیا ہے، بحال کر دیں گی۔

اسی کے ساتھ اوقاف کے متولیان بلکہ مدارس و مساجد، مقابر وغیرہ کے ذمے داران کا فرض ہے کہ اپنے کاغذات ٹھیک کر لیں تاکہ بوقت ضرورت ان کو عدالتوں میں پیش کیا جا سکے۔ کاغذات کا نہ ہونا حکومتی کارندوں کے لئے من مانی کا راستہ کھولتا ہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے کاغذات جیسے پیدائش سرٹیفکٹ، تعلیمی لیاقت کے سرٹیفکٹ اور گھروں اور جائیدادوں کے کاغذات تیار کر کے رکھیں کیونکہ اگلے دنوں میں کبھی بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور نہ ہونے پر شدید خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

تاریخ فقہ اسلامی

از: علامہ محمد الخضری مترجم: مولانا عبد السلام ندویؒ

علامہ محمد الخضری کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی، فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ کی شکل میں سامنے آئی جس میں اسلام کے ہر دور کے فقہی تغیرات، خصوصیات اور امتیازات کو تفصیل سے دکھایا گیا اور علل و اسباب کی تشریح کی گئی۔ ان خوبیوں کی وجہ سے مولانا عبد السلام ندوی نے اس کو اردو میں تاریخ فقہ اسلامی کے نام سے اس خوبی سے منتقل کر دیا کہ ترجمہ، اصل سے زیادہ دلکش بن گیا۔

صفحات: ۴۷۱ قیمت: ۴۵۰روپے

وفیات

آہ! خورشیدِ فکر و عمل غروب ہو گیا

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دارالمصنّفین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے فکری جانشین، جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر، مشہور ماہر معاشیات و تعلیمات، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور کے سابق مدیر پروفیسر خورشید احمد نے ۱۳/ اپریل ۲۰۲۵ء کو ۹۳ سال کی عمر میں برطانیہ کے لیسٹر شہر میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔

وہ ۲۳/ مارچ ۱۹۳۲ء کو نئی دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نئی دہلی میں حاصل کی۔ حصول علم کے دوران چھوٹی عمر ہی میں سیاست سے دلچسپی لی اور ہندوستان کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے رکن بن گئے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ نئی دہلی سے لاہور، ہجرت کر گئے۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے لیے لاہور اور پاکستان کے زیر انتظام پنجاب کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور معاشیات اور اسلامی مطالعات میں ماسٹر کی سند حاصل کرنے کے بعد برطانیہ کی لیسٹر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی طلبہ یونین کے رکن اور ۱۹۵۳ء میں ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں باقاعدہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ پروفیسر صاحب ۱۹۷۸ء میں وفاقی وزیر منصوبہ و ترقی بنائے گئے۔ حکومت پاکستان کے پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین رہے۔ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۳ء تک شاہ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ کے وائس پریسیڈنٹ رہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۸۴ سے ۱۹۹۲ء تک انٹرنیشنل سنٹر فار ریسرچ اِن اسلامک اکنامکس لیسٹر کے ایڈوائزری بورڈ کے ارکان میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۲ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے اور سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے امور اقتصادی و منصوبہ بندی کے چیئرمین کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد دو اداروں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور

اسلام آباد اور لیسٹر (یوکے) کی اسلامک فاؤنڈیشن کے بانی چیئرمین تھے جو مغربی دنیا میں اسلامی معاشیات اور مالیات کا پہلا تعلیمی مرکز ہے۔ اسلامک سنٹر زاریا (نائجیریا)، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، فاؤنڈیشن کونسل، رائل اکیڈمی فار اسلامک سویلائزیشن عمان (اردن) کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے رکن اور اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی اور لاہور کے وائس پریسیڈنٹ بھی رہے۔ وہ یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے بانی صدر ہیں اور اسلامی دنیا کے متعدد اداروں اور تنظیموں کے بورڈز میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ برطانیہ کی لیسٹر یونیورسٹی میں عصری فلسفے کے استاد بھی رہے۔

ان اداروں سے وابستگی اور ان کی مسلسل علمی وانتظامی مصروفیات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کی زندگی عمل پیہم سے عبارت تھی۔ انہوں نے حیات مستعار کا جو مقصد پیش نظر رکھا تھا اس سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ایام طالب علمی سے ہی انہیں مطالعہ وکتب بینی اور کتابیں جمع کرنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ اسی شوق وذوق کی وجہ سے ان کی ذاتی لائبریری میں ۲۰ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں جن میں سے کچھ اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کو عطیہ کیں۔ لیسٹر میں بھی ان کے پاس ۷ یا ۸ ہزار کتابیں تھیں جن کا بیشتر حصہ اسلامک فاؤنڈیشن کو ہدیہ کیا اور بہت سی کتابیں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کو بھی دیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے خاص انس اور ان کی فکری ودینی شخصیت کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا تھا۔ اپنی کارآمد اور مفید زندگی کے پیچھے ان کی صحبت کو سب سے اہم خیال کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اس حوالے سے میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالی نے مجھ پر اتنا کرم کیا کہ ایسے خادم دین اور ایسی عظیم شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دانش برہانی سے فیض پانے والی اس شخصیت کے افکار عالیہ سے اپنی فکر کو جلا بخشنے، اس کی صحبت میں زندگی کے اسالیب سیکھنے اور اس کی امارت وقیادت میں اجتماعی زندگی گذارنے کا موقع ملا ہے۔ اسے زندگی کا حاصل اور ایک بہترین انعام سمجھتا ہوں بلکہ زیادہ اہم کہ اگر کہوں کہ زندگی کا رخ متعین کرنے اور اسے بامعنی بنانے میں جس چیز نے اصل کردار ادا کیا وہ یہی تعلق تھا۔ (ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۳ ص ۹۰)

تصنیف وتالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انگریزی اور اردو میں کئی کتابیں تصنیف کیں اور درجنوں کتابیں ترتیب دیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات، اسلامی ریاست،

معاشیات اسلام، ادبیات مودودی، تذکرہ زنداں، ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل، اسلامی تحریک درپیش چیلنج، اسلامی دنیا کی بے اطمینانی ۱۱/ ستمبر سے پہلے اور بعد، چراغ راہ کا "اسلامی قانون نمبر" وغیرہ ان کی ایسی کتابیں ہیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کے اندر اسلامی فکر وفلسفہ کو جدید تقاضوں کے مطابق سمجھنے میں مدد کی اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی سازشوں اوران کی ریشہ دوانیوں سے کماحقہ واقفیت کا موقع فراہم کیا۔ اسلامی تحریک کا فکری سفر نامہ کے نام سے ان کے مقالات کا ایک مجموعہ ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے مرتب کیا ہے۔ ترجمان القرآن اور چراغ راہ وغیرہ جیسے متعدد اہم رسائل وجرائد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے جن سے ان کے اعلی اور معیاری ذوق صحافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتابوں کے علاوہ مختلف علمی، سیاسی اور دینی موضوعات پر سینکڑوں مقالات سپرد قلم کیے۔ سو سے زائد سیمیناروں میں مقالہ نگار اور نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ خورشید صاحب کو قدرت کی طرف سے تحریر کے ساتھ تقریر کا ملکہ بھی عطا ہوا تھا۔ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو کسی اور کے بولنے کی گنجائش بہت کم چھوڑتے۔ ترکی، ملیشیا اور جرمنی کی جامعات میں ان پر ڈاکٹریٹ کے مقالات لکھے گئے۔

دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کی طرف سے انھیں جتنی اعزازی ڈگریاں ملیں کم ہی کسی مسلم اسکالر کے حصے میں آئیں۔ تعلیمی میدان میں ان کی نمایاں خدمات پر جامعہ کراچی نے انھیں تعلیم میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ برطانیہ کی یونیورسٹی آف لیسٹر اور ملیشیا کی یونیورسٹی آف ملایا نے بھی انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا تھا۔ برطانیہ کی Loughborough (لف برا) یونیورسٹی نے بھی انھیں ۲۰۰۳ میں ادب میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ملائیشیا نے انھیں ۲۰۰۶ میں اسلامی معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اس کے علاوہ اسلامی معاشیات اور عصری اسلامی افکار پر تحقیق میں ان کو نمایاں مقام اور دنیا بھر میں ماہر اقتصادیات اور ماہر تعلیم کے طور پر شناخت حاصل ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کو جو متعدد باوقار ایوارڈز اور اعزازات ملے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

اسلامی معاشیات میں ان کی شاندار خدمات پر ۱۹۸۹ء میں اسلامی ترقیاتی بینک ایوارڈ، ۱۹۹۰ء میں کنگ فیصل انٹرنیشنل پرائز، سائنس اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ ۲۰۱۱ء میں پاکستان کے سب سے بڑاے سول ایوارڈ آرڈر آف ایکسیلنس سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر خورشید صاحب کو پہلا اسلامی ترقیاتی بینک ایوارڈ اور امریکن فنانس ہاؤس پرائز بھی ملا تھا۔

مثالی رہنما کے اوصاف سے متصف تھے۔ حق گوئی، ثابت قدمی اور حمایت عدل وانصاف

کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جنرل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں لگنے والے مارشل لاء کے خلاف طلبہ اور سیاسی تحریک میں اہم کردار ادا کیا اور قید و بند کی سنت یوسفی بھی ادا کی۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں کے دوران پاکستانی یونیورسٹیوں میں بائیں بازو کے نظریات کی حامل طلبہ تنظیموں اور انجمنوں کا مقابلہ کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کی فکر سے تادیر استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ ان کے کارنامے ان کی غیر معمولی دماغی و ذہنی لیاقت کے شاہد عدل ہیں۔ اللہ تعالی علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مولانا عبد الجواد اصلاحی مرحوم

افسوس کہ ۱۲/اپریل کو مولانا عبد الجواد اصلاحی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر میں سابق ناظم دارالمصنّفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے زمانے میں عربی سوم میں تھے۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی مرحوم کے ہم سبق تھے۔ عجیب اتفاق کہ ان کے دونوں ہم درسوں نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ سرائے میر سے چند میل کے فاصلے پر واقع کنیتھا ان کا وطن تھا۔ فراغت کے بعد انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کے دائرۂ حمیدیہ پریس میں بہت دنوں تک کام کیا جس میں کانٹے کی چھپائی ہوتی تھی۔ مدرسۃ الاصلاح کے نصاب میں شامل کتابیں اسی پریس میں طبع ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں ٹائپنگ اور کمپوزنگ کا کام مولانا ہی انجام دیتے تھے۔ بعد میں مولانا احمد محمود کوثر اصلاحی مرحوم نے یہ پریس خرید لیا تھا۔ جامعہ تہذیبیہ، سنجرپور کے قیام اور جامعۃ الفلاح بلریاگنج کے شعبۂ نسواں سے اس کا الحاق کرانے میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اطراف کے نہ جانے کتنے طلبہ نے مولانا کی تحریک سے مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ لیا۔ دارالمصنّفین اور جماعت اسلامی کے لٹریچر کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ جماعت کے دیرینہ رکن اور اس کے بے لوث خادموں میں تھے۔ خطابت کا عمدہ ذوق تھا۔ جس موضوع پر چاہتے برجستہ بولتے۔ درس قرآن کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا۔ جہاں جاتے درس قرآن کی ان سے خواہش کی جاتی۔ گذشتہ چند برسوں سے اعظم گڑھ شہر میں مہینے میں ایک دن درس قرآن کے لیے ضرور تشریف لاتے۔ شب میں قیام فرماتے اور فجر کے بعد دارالمصنفین کی مسجد میں درس دیتے۔ کئی دفعہ شبلی منزل میں خطبۂ جمعہ بھی دیا۔ ان کے درس کی قابل ذکر خصوصیت آسان زبان و اسلوب میں حالات حاضرہ سے آیتوں کا انطباق تھا جسے حاضرین بہت پسند کرتے۔ منکسر المزاج اور سادگی پسند تھے۔ عوامی مقبولیت بھی حاصل تھی۔ اللہ تعالی مرحوم کی نیکیوں کو قبول اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ (ک،ص اصلاحی)

باب التقریظ والانتقاد

الحل المدلل علی الدارمی من النصف الاول

محمد عمیر الصدیق ندوی

علم حدیث کے تعلق سے نئی مطبوعات کا مبارک سلسلہ عصر حاضر میں جاری ہے اور غالباً پہلے سے زیادہ قوی اور کارآمد بھی ہے۔ تشریح، تحقیق، تعلیق، تخریج اور تہذیب کی جدید ترین کاوشوں نے علم حدیث میں یقیناً بہترین اضافہ کیا ہے۔ اسی سلسلۂ تحقیق میں پیش نظر کتاب بھی ہے۔ جو بعض خوبیوں سے موجودہ تالیفات میں نمایاں درجہ اور حیثیت کی حامل ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ امام دارمی کی مسند یا سنن کے نصف اول کی حدیثوں کی تشریح ہے۔ اس مجموعۂ احادیث کی اہمیت صحاح ستہ ہی کی طرح بیان کی جاتی رہی ہے۔ بلکہ بعضوں نے تو ابن ماجہ کی جگہ دارمی ہی کا انتخاب کیا۔ امام دارمی کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ان کے تلامذہ اور رواۃ کے ناموں ہی سے ہو جاتا ہے جن میں امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبد اللہ وغیرہ ائمۂ محدثین شامل ہیں۔

دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی کے نصف کا زمانہ امام دارمی کا زمانہ ہے۔ دارم ان کے اجداد امجاد میں تھے۔ اسی لیے دارمی کی نسبت نسبی اختیار کی، وطن سمرقند تھا، لیکن سمرقندی کی وطنی نسبت، دارمی کی شہرت کی وجہ سے زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ اسلام کی آمد کے سوڈیڑھ سو سال کے اندر ہی ملکوں اور علاقوں کی دوریاں جس طرح دور ہوئیں اور فاصلوں نے قربتوں کو جس طرح اپنی آغوش میں لیا، یہ اسلام کے ذریعہ عالمی جغرافیائی معنویت کا انقلاب تھا۔ امام دارمی سمرقند میں پیدا ہوئے اور خراسان، شام، عراق، مصر اور حرمین شریفین میں علم کی تلاش میں ان کی موجودگی، دوسری صدی ہجری میں اسلام کے زیر سایہ ایک نئی دنیا کے ظہور کی علامت بن گئی۔ امام دارمی کے لیے جہاں حفظ واتقان اور ثقہ، صدق، ورع اور زہد کی صفات آتی ہیں وہیں ان کو احد الرحالین فی الحدیث کی امتیازی شناخت بھی حاصل ہوئی۔ حضرات محدثین کی زندگیوں میں رحلات واسفار کی امتیازی شان میں غور و فکر کے لیے بہت کچھ ہے۔ پیش نظر کتاب میں اس خوبی کا

ذکر محض جملہ زائدہ نہیں۔ اس خیال کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ امام دارمی کے اس مجموعۂ احادیث کے وجود، اس کی یافت، اس کی اشاعت اور پھر اس کی تشریح و تحقیق کا سفر بہت دلچسپ ہے۔ اور یہ اس بحث سے الگ ہے کہ یہ مجموعۂ احادیث سنن ہے یا مسند۔ یہ امام دارمی کے صفات حفظ وضبط، معرفت وہدایت، ثقاہت، عقل و دانش، عبادت، زہد و تقویٰ اور سنت وحدیث کی مدافعت وغیرہ سے بھی الگ ہے کہ ان صفات پر ان کے سوانح نگاروں کا عام اتفاق ہے۔ اتفاق نہیں ہے تو اس بات پر کہ یہ مسند ہے یا سنن۔ اگر صحابہ کرام کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہونا مسند کی شرط ہے اور فقہی ابواب پر حدیثوں کی ترتیب، ان کو سنن کے زمرہ میں لاتی ہے تو اس مجموعہ کو سنن کہنا زیادہ صحیح ہے۔ بہر حال یہ مسند ہو یا سنن، اس کی اہمیت اور استناد صحاح ستہ کے معیار کے مطابق ہی ہے۔ اسی لیے علماء و محدثین نے اس کا تذکرہ ہمیشہ نہایت بلند الفاظ میں کیا۔ ظاہر ہے سنن دارمی دوسرے تمام مجموعوں کی طرح مخطوطہ کی شکل میں صدیوں تک متداول رہی اور جب طباعت کا دور آیا تو یہ بھی طبع ہوئی لیکن اس طباعت کی داستان اس لیے اہم اور دلچسپ ہے کہ اس کا تعلق علمائے ہند کی خدمات حدیث سے سامنے آتا ہے۔ یعنی سنن دارمی کی طباعت سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی۔ ۱۲۹۳ھ میں کانپور کے مطبع نظامی سے مولوی ابوالفتح محمد عبدالرشید اور محمد عبدالرحمٰن کی تحقیق اور کوششوں سے سنن دارمی چھپی۔ ابوالفتح محمد عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری تھے، سنی تھے اور اس نسخہ کی طباعت کے وقت وہ ریاست بھوپال میں مقیم تھے اور جس کے لیے اس پہلے مطبوعہ نسخے کے مقدمے میں انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس شہر بھوپال کو ہر آفت وشر سے محفوظ رکھے۔ اسی مقدمے میں انہوں نے ہندوستان میں اس کتاب کی آمد اور طباعت کے ذکر میں لکھا کہ ہندوستان میں کہیں بھی سنن دارمی کا کوئی نسخہ نہیں تھا، علماء کو بھی اس کا نام نہیں معلوم تھا۔ یہ نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں تھے، جنہوں نے زیارت حرم شریف میں شیخ محمد اسحاق کے پاس سنن کا ایک نہایت بوسیدہ مخطوطہ دیکھا، ان سے وہ نسخہ عاریتاً حاصل کیا۔ یہ نسخہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی نظر سے بھی گزرا تھا اور اس میں ان کے کچھ حواشی بھی تھے۔ اس بیش قیمت نسخہ کو نواب صاحب نے شیخ محمد اسحاق کے داماد مرزا امیر بیگ سے حاصل کیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو بھوپال میں نقل کیا، یعنی اس کی کتابت کا آغاز بلد اللہ الحرام سے ہوا اور اختتام بھوپال کے باب اسکندر میں ہوا۔ اسی نقل سے مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں کی مدد سے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت انجام دی۔ بعد میں اس کی طباعت نواب شاہجہاں بیگم کے حکم سے مطبع نظامی کے سپرد کی

گئی۔ نواب شاہجہاں بیگم کے لیے حسنہ من حسنات الزمن وبرکۃ من برکات الرحمن، دیباجۃ الدنیا ومکرمۃ الدھرونکتہ العطارد التی یفتخر بہا الفخر من ذکرھا تواریخ الکرم والنعم حضرتنا نواب شاہجہاں بیگم جعل اللہ الدنیامشرفۃ بوجودھا ومعمورہ ببحار عطائ ھا وجودھا جیسے الفاظ اور جملے اس مقدمہ میں آ گئے ہیں۔

اس کتاب کی سند میں مولوی الٰہی بخش، سید صدیق حسن خاں اور شیخ قاضی حسین بن محسن السبعی الانصاری کا ذکر بھی ہے۔

کتاب کی فہرس کا عنوان فہرس ابواب السنن المبارکہ للامام ابی محمد الدارمی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے الفاظ سے ہے۔ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں (۸۰) ابواب ہیں دوسرا حصہ کتاب الصلوۃ سے شروع ہو کر کتاب فضائل القرآن پر ختم ہوتا ہے۔

امام دارمی اور ان کی سنن کے ذکر میں معلومات اور جگہوں پر زیادہ تفصیل سے موجود ہیں، یہاں ان کے مختصر اعادہ کو اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ہمارے پیش نظر سنن دارمی کی ایک شرح نے اس سنن کی اہمیت اور ہندوستان سے اس کے خاص تعلق کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔

یہ حقیقت غیر معمولی ہے کہ امام دارمی متوفی ۲۵۵ھ کے قریب ایک ہزار سال بعد سنن دارمی کی شرح شاہ نعیم عطا متوفی ۱۳۸۵ھ نے سپرد قلم کی اور پھر ۱۳۲۲ھ میں اس کی پہلی جلد طبع ہوئی جس میں قریب دو سو احادیث شریفہ کی شرح کی گئی تھی۔ پیش نظر کتاب میں 'کلمہ ناشر' سے معلوم ہوا کہ شاہ نعیم عطا نے شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی کو خط لکھ کر یمن سے ہندوستان آنے اور سلون کی خانقاہ کریمیہ کی زیارت کرنے کی دعوت دی تھی۔ شیخ یمنی نے دعوت قبول کی اور کچھ وقت سلون میں قیام کیا اور شاہ نعیم عطا کو روایت کی اجازت دی۔

شاہ نعیم عطا کی مطبوعہ شرح مختصر اور نامکمل تھی، اس کو مزید بہتر اور ترتیب وتدوین کی جدید شکل میں پیش کرنے کی ضرورت نے پیش نظر کتاب کو وجود بخشا اور اس کے لیے بجا طور پر محشی ومرتب کے ساتھ ڈاکٹر محمد نعمان خاں سابق پروفیسر شعبہ عربی دلی یونیورسٹی کا نام سرورق پر دیا گیا، پروفیسر موصوف نے کلمات تقدیم میں یہ خیال ظاہر کیا کہ سنن یا مسند دارمی، اپنی اہمیت کے باوجود، ہندوستان اور بیرون ہند کہیں بھی درسیات حدیث میں شامل ورائج نہیں رہی، البتہ انفرادی طور پر یہ بعض علماء کے خاص درسیاتی حلقوں میں نظر آتی رہی۔ سلون رائے بریلی کی خانقاہ کریمیہ بھی ایسے خاص استثنائی مدارس میں ہے جہاں سنن کی باقاعدہ تدریس ہوتی رہی۔ دارمی کے تعلق سے ہندوستانی

اولیات میں یہ امتیاز بھی کم اہم نہیں۔ سنن کی پہلی بار طباعت، اس کی پہلی جامع شرح اور اس کی باقاعدہ تدریس، ان تمام امتیازات نے ہندوستان کو عالم اسلام میں نمایاں فضیلت عطا کردی۔ اب تو سنن کی بہ کثرت طباعتیں ہیں، اس کی شرحیں بھی دسیوں جلدوں میں شایع ہوچکی ہیں۔ تاہم الحل المدلل کی جدید طرز تحقیق و تصحیح کی اپنی اہمیت ہے۔ مراجع و مصادر اور جدید املا کی موجودگی بھی نفع وافادہ کو اور بھی بہتر بناتی ہے۔ شارح کی زبان و تعبیر اگر کہیں کہیں گنجلک نظر آئی تو اس کی تسہیل بھی ضروری ہوگئی ہے۔ جدید قاری کے لیے مطالعہ کی آسانی کا خیال ایک محقق و مصحح کے لیے سب سے اہم عمل بن جاتا ہے۔ الحل المدلل کو ان ہی جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کا جذبہ تھا جس نے پیش نظر شرح دارمی کو خوب سے خوب تر بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے لیے جو ژرف نگاہی اور عرق ریزی مطلوب ہے اس کا اندازہ، کتاب کے مطالعہ ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں علامات النبوہ کے بارہ ابواب اور کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے بالترتیب قریب چھپن (۵۶) اور ڈیڑھ سو ابواب کی حدیثیں شامل ہیں۔

شرح اور پھر تحقیق جدید کا اندازہ پہلی ہی روایت سے کیا جاسکتا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی ﷺ من الجھل والضلالۃ، اس سرخی پر حاشیہ بتاتا ہے کہ الدارمی (۱/۱۵۱-۱۵۳، نظامی، ص ۲) میں باب کا عنوان اسی طرح ہے اور ظاہر یہی ہے کہ عنوان اسی طرح دارمی کے تمام نسخوں میں آیا ہے۔ شیخ الغمری آل علوی نے عنوان کتاب میں اس جملے کا بھی اضافہ کیا ہے کہ ”کتاب علامات النبوۃ وفضائل سید الاولین والآخرین“ انھوں نے حاشیہ میں لکھا کہ اس طرح میں نے اجتہاداً شرح میں یہ عنوان دیا لیکن پھر حافظ ابن حجر کو اتحاف المہرہ میں یہی عنوان دیتے دیکھا۔

عنوان کے بعد (الشرح) حاشیہ ۲ میں اصل عبارت کے متعلق لکھا کہ اس عنوان کے بعد شرح، بسملہ سے شروع ہوئی، دارمی نے بھی اسی طرح شروع کیا، اس لیے ہم نے یہاں دوبارہ نہیں لکھا۔

آگے روایت میں کل امر ذی بال لا یبدا میں لا پر حاشیہ بتاتا ہے کہ اصل نسخہ میں لا کی جگہ لم ہے۔

اسی روایت پر حاشیہ (۴) کے تحت آیا کہ اس روایت کی تضعیف زیلعی نے تخریج الکشاف (۱/۲۴) میں اور شیخ البانی نے ”ارواء الغلیل (۱/۲۹)“ میں کی ہے۔ لیکن علماء کی ایک جماعت نے اس روایت کو حسن اور صحیح بھی قرار دیا ہے۔ امام نووی اور ابن حجر نے حسن اور ابن دقیق العید اور

ابن الملقن نے صحیح قرار دیا ہے۔اس کے بعد تاریخ الزیارۃ اور عجلونی کی کشف الخفاء، سے اور پھر نووی، عبدالقادر رھادی کے اقوال جمع کرکے اس حدیث کی فنی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ صرف ایک لفظ اور ایک روایت کی تصحیح و تحقیق ہے۔ باقی اس روایت پر شارح کی تعبیرات کی کیفیت تو جدا ہی ہے۔

روایت پر شاہ نعیم عطا کی شرح فان قلت سے شروع ہوتی ہے کہ اگر آپ کہیں کہ ابتدا اگر حمد سے کی جائے تو وہ بھی تو واجب للخیر ہے تو میں کہوں گا کہ ابتدا کرنا اس بات سے زیادہ عام ہے کہ لکھ کر یا زبان سے ادا کی جائے اور اس لفظ میں دونوں قسموں کے اختیار کی جانب اشارہ بھی ہو۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب کلمات رسالت کی جامع ہے اس لیے اس کی ابتدا راوی کے کلام سے ادباً مناسب نہیں، جب کہ نہی منصوص ہے لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔ پھر خبر واحد کا تعارض منزّل متواتر سے بھی نہیں رہ جاتا۔ البتہ سند پہلے آئی تو یہ ضروری اور لابدی ہے اور یہ تقدیم، اس تمہید و تقدیم کی طرح ہے جو خدمت گزار اپنے آقا کے لیے پیش کرتا ہے۔

یہ صرف ایک روایت کی شرح اور تحقیق کی مثال ہے۔اسی سے اس پوری جلد کی قدر و قیمت اور شارح کے علاوہ محقق و تعلیق نگار کی محنت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا۔

اس اشاعت کی ایک اضافی خوبی وہ مقدمہ ہے جس کو ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری نے انگریزی میں لکھا اور ڈاکٹر عبدالملک رسولپوری نے اس کو عربی قالب عطا کیا۔ اس مقدمہ میں سلون رائے بریلی کی خانقاہ و خانوادہ کریمیہ کی وہ تاریخ آگئی ہے جس سے عام طور پر خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی واقف نہیں۔ شاہ محمد نعیم عطا (۱۸۸۱ء-۱۹۶۶ء) کا خانوادہ، ہجرت کی سنت ادا کرتے ہوئے خدا جانے کتنے دشت و صحراؤں سے گزر کر علوم اسلامیہ کی متاع کو سینے سے لگائے اودھ کے اس خطے کی آبادی کا ذریعہ بن گیا جو شاید ابتدائے آفرینش سے اپنی خاک کی الگ تاثیر سے معروف ہے اور الگ حیثیت کے قصبات کی شکل میں آج بھی دوسری آبادیوں سے ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ سلون کے اس علمی خانوادہ کی ہجرت کی راہ میں ناگور، دہلی، جونپور جیسے مقامات آتے رہے۔ علم و ذکر اور ان دونوں کے مجموعہ یعنی تصوف سے اس خانوادہ کی شناخت ہوتی رہی۔ یہ وراثت شیخ حمید الدین ناگوری کی برکت تھی۔ اور اس برکت کا ایک نہایت خوشگوار اثر، علم حدیث کی خدمت کا اس خاندان کو عطا ہوا۔ اس مقدمہ میں صرف خاندان ہی نہیں، انگریزوں کے دور میں خانقاہوں کے

کردار پر بھی عمدہ گفتگو کی گئی۔ یہ کردار دعوت وعزیمت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اوراس میں سب سے خوبصورت رنگ علوم دینیہ کا ثابت ہوا۔ خانقاہ میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد وجانشین مولوی عبد الباسط جائسی نقشبندی، مولوی عبد القادر دہلوی، مولوی نور محمد سیالکوٹی جیسے اکابر علماء درس و تدریس سے وابستہ رہے، شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری نے اس روایت کو اور تابناک بنادیا۔ مولانا فاروق چریاکوٹی نے بھی کچھ عرصے تک یہاں تدریسی زندگی گزاری۔ یہ داستان بہت دلچسپ ہے اور امام دارمی کی رحالیت اور علم حدیث سے اشتغال کی مسلسل روایت کے پس منظر میں یہ معلومات لطف دے جاتی ہیں۔

ایک باب میں شارح دارمی شاہ محمد نعیم عطا کے حالات بھی سلیقے سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان کی عربی، فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست بھی دی گئی، اس میں حدیث کے علاوہ نحو، منطق، فقہ، تصوف اور شعر وادب کی قریب تیئیس کتابوں کا ذکر ہے۔

ایک اور بحث ہندوستان میں خانقاہی تصوف کے نظریات اور معاشرتی روابط پر بھی ہے۔ اسی طرح خانقاہ کریمیہ کے سجادہ نشینوں کی فہرست بھی سال بہ سال دی گئی ہے۔

یہ تمام تحریریں قیمت میں کیا کم تھیں کہ مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی کے قلم سے شیخ محمد نعیم عطا کے احوال، تحقیق کے بلند معیار کا نمونہ بن گئے۔ انھوں نے سابقہ تحریروں کے اجمال کو وضاحت وصراحت وقطعیت کی عطا کر دی اور شیخ حسین بن محسن یمانی کی سند اجازت بھی درج کر دی۔

شیخ نعیم عطا کے حالات پر مشتمل ایک تحریر شیخ فتح محمد تائب کے قلم سے ۱۹۰۴ء کی ہے اور اختصار کے باوجود جامعیت کی بہترین مثال ہے۔

ان خوبیوں کا حق تھا کہ سنن دارمی کے اس نسخہ ہندیہ کا تعارف کسی قدر تفصیل سے کیا جائے اوراس کی موجودہ کامل ترین، جامع ترین اور خوبصورت ترین شکل کے لیے ڈاکٹر محمد نعمان خاں اور ڈاکٹر ظہیر حسین جعفری کو نذرانہ تشکر پیش کیا جائے۔ خاص طور پر عربوں اور عربی دانوں کے لیے اسلامی ہند کی علمی خدمات کے تعارف کا جو سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ یہ کتاب اسی مبارک تسلسل کا عمدہ نمونہ ہے۔ خانقاہ کریمیہ کی کرامتوں میں اسے شمار کیے جانے میں شاید ہی کسی کو عذر ہو۔ کتاب کی قیمت درج نہیں۔ پتہ یہ ہے: خانقاہ کریمیہ، سلون، ضلع رائے بریلی، یوپی ۲۲۹۱۲۷۔

تبصرۂ کتب

عبد العلیم الاعظمی، حماس اسرائیل جنگ: حقائق و شواہد، ۲۵۷، صفحات، ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۵۰ روپئے۔ تقسیم کار: نگارشات بک اسٹور دیوبند، موبائل: ۸۷۹۱۵۱۹۵۷۳

مسئلہ فلسطین اگرچہ کافی پرانا ہے اور مختلف زبانوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ سے حماس اور اسرائیل کے درمیان چھڑی جنگ پر شاید یہ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جو ایسے وقت آئی ہے جبکہ موجود جنگ کو چھڑے ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکے ہیں۔ یہ جنگ اب بھی جاری ہے اور اسرائیل کے ظلم اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے فی الحال اس کے خاتمے کی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی شہ کی وجہ سے اسرائیل اس عرصے میں نہ صرف غزہ کے تقریباً ایک لاکھ چونسٹھ ہزار لوگوں کو شہید یا زخمی کر چکا ہے اور غزہ کے اکثر مکانات، مساجد، اسپتال، یونیورسٹیوں، اسکولوں اور انفراسٹرکچر کو تباہ کر چکا ہے بلکہ اب اس نے جنگ کا مقصد غزہ سے بالعموم فلسطینیوں اور بالخصوص حماس کے انخلاء کا بنالیا ہے جس میں اسے نئے امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی مکمل تایید حاصل ہے۔ موجودہ کتاب میں اصل عربی اور انگریزی مآخذ سے استفادہ کر کے نہ صرف تاریخ فلسطین اور سابقہ فلسطینی مزاحمتی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ حماس کی حقیقت، طوفان الاقصی کی وجوہات اور اس دوران اسرائیل کے جنگی جرائم کی تفصیلات، مختلف ممالک کی پالیسیوں، دنیا بھر میں احتجاجات نیز فلسطین اور پورے مشرق وسطی پر طوفان الاقصی کے اثرات شامل ہیں۔ فاضل مؤلف جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیر تعلیم ہیں اور اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بروقت اور عمدہ تصنیف پر وہ قابل مبارکباد ہیں۔ (ڈاکٹر ظفر الاسلام خان)

ڈاکٹر جاوید جمیل، قرآن پاک کا مطالعہ بطور سسٹم (انگریزی)

Dr. Javed Jamil, *A Systematic Study of the Holy Quran*

مشن پبلیکیشنز، منگلور، تیسرا ایڈیشن ۲۰۲۴ء، ۳۸۷ صفحات، قیمت ۱۱۵۰ روپئے۔ ای میل:

doctorforu123@yahoo.com

ڈاکٹر جاوید جمیل پیشے سے طبی معالج ہیں لیکن انہوں نے کافی عرصے سے خود کو قرآن پاک

کے مطالعے کے لئے وقف کر رکھا ہے اور انگریزی میں متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ وہ عصری مسائل پر بکثرت انگریزی میں مقالات بھی لکھتے رہے ہیں۔ڈاکٹر جمیل ۲۰۱۷ سے منگلور کی ینیپویا یونیورسٹی میں اسلامی چیئر کے صدر ہیں اور وہاں اپنے نظریہ کے لحاظ سے نہ صرف تعلیم دے رہے ہیں بلکہ ریسرچ بھی کرا رہے ہیں۔ موجودہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ پہلی بار ۲۰۲۱ میں شائع ہوئی تھی۔اب یہ تیسرا ایڈیشن کافی نئے مواد کے ساتھ سامنے آیا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اسلام کی روشنی میں زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے متعدد ماڈل تجویز کئے ہیں جن میں طب وصحت، سیاست ومعاشیات وغیرہ شامل ہیں۔اس کتاب میں ایمان، قرآنی فلسفہ، قرآنی دستور، قرآنی نظام اور حق وباطل کے درمیان کشمکش جیسے ابواب شامل ہیں (ظ۔ اَ۔خ)

ڈاکٹر صابر علی سیوانی، روضۃ الشہداء اور کربل کتھا (تقابلی مطالعہ)، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲ قیمت :۴۰۰ روپے، پتہ مرکز مطالعات اردو ثقافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد، تلنگانہ۔۵۰۰۰۳۲ اور ہدیٰ بک ڈپو، پرانی حویلی، حیدرآباد اور بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار۔موبائل:۹۹۸۹۷۶۰۸۸

سانحہ کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے رفقا کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام ہی کا ناقابل فراموش اور نہایت اذیت ناک باب ہی نہیں ہے، یہ جذبات واحساسات کی ایسی داستان بھی ہے جو صدیوں ادب اسلامی کا ناگزیر حصہ بنتی آئی ہے۔عالمی نثری اور شعری ادب کا تو پتہ نہیں لیکن عربی فارسی اور اردو میں رثائی ادب کا وجود ہی گویا کربلا سے ہے، خصوصاً جب بھی معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدروں سے پہلو تہی کی گئی اور تہذیبی زوال میں تیزی آئی اور ناانصافی اور حق تلفی کی فضا عام ہوئی، تو حساس دلوں کو کربلا کی یادوں نے بے ساختہ آواز دی۔ ہندوستان میں مغل حکومت کے آخری دور نے صرف عزاداری ہی کو زندگی نہیں دی، مرثیہ گوئی کے لیے بھی فضا ساز گار بنادی، اسی فضا کی یادگار فضلی کی کربل کتھا ہے۔اردو کے ریختائی عہد کی یہ کتاب اردو میں داد تحقیق دینے والوں کے لیے ایک خاص کشش کا سبب بنتی رہی ہے اور اس خاص کشش کی وجہ یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ کربل کتھا شمالی ہند کی پہلی نثری کتاب ہے جو اردو یا ریختہ میں لکھی گئی۔ فضل علی فضلی صرف اسی کتاب کی وجہ سے اردو محققین کی زبانوں اور ذہنوں پر چھا

گئے۔ اردو زبان کے موٴرخوں کے لیے فضلی کا ذکر گویا فرض عین ہو گیا، اس اعتناء اور تعلق نے کربل کتھا کے مطالعہ کو وہ استمرار اور تسلسل عطا کیا جس سے ولی دکنی بھی محروم رہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی کربلائی ادب کا جدید ترین حصہ ہے، جدت یہ بھی ہے کہ کربل کتھا جس سر چشمے کے فیضان کا نتیجہ یا اضافہ بنی یعنی ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب ''روضۃ الشہداء'' اس کے اثرات کے مفصل جائزہ نے اس مطالعہ و تجزیہ کو واقعی جدت کا حقیقی رنگ عطا کر دیا۔ گہرے مطالعہ نے فاضل مصنف و محقق کو دونوں کتابوں کی روح تک پہنچنے اور دوسروں تک پہنچانے کی امتیازی شان سے ہمکنار کر دیا۔ کربلا کے واقعات کو فارسی اور اردو دونوں میں ادب کے ذریعہ تاریخ کے لیے کتاب حوالہ بنا دینے کے اسباب پر اتنی گہرائی سے کم نظر کی گئی، کربل کتھا کے محمد شاہی عہد کے ماحول اور روضۃ الشہداء کے عہد تالیف کے معاشرتی اور سیاسی افرا تفری اور تہذیبی و اخلاقی قدروں کے زوال ہی نہیں، ان کی تباہی و بربادی کی مماثلت کو تاریخ ہی کے حوالوں سے جس طرح دیکھا گیا اور اسی نظر سے تقابلی تجزیہ کی کوشش کی گئی، اس سے یہ کتاب اپنے موضوع پر زیادہ کامل اور زیادہ مفید اور زیادہ غور طلب ہونے کے دعوے کا ثبوت بن گئی۔

فاضل مصنف کی پہچان ان کی حد درجہ محنت اور موضوع کے تمام اطراف و ابعاد پر نظر کی وسعت اور پھر ان کے بیانیے کی کلی وضاحت کی خوبیوں سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دونوں کتابوں اور ان کے موٴلفین کے مکمل حالات اور ان کی دیگر تصانیف کے ساتھ یکجا زبانوں کی تہذیب اور ادب کے پس منظر میں دونوں کتابوں کا الگ الگ تنقیدی جائزہ لے کر اور پھر ایک باب میں دونوں کے تقابلی مطالعہ کو جس گہرائی سے پیش کیا ہے، اس سے دقت نظر اور ژرف نگاہی اور جاں کاہی اور محنت و جستجو کے حقیقی معنی بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ عزاداری اور مرثیہ کی روایت پر پہلا باب ان دونوں کتابوں کی تفہیم کے لیے غضب کی معلومات کا ذریعہ بن گیا ،الگ الگ زبانوں میں ایک ہی موضوع پر دو کتابوں بلکہ اصلاً ایک ہی کتاب کے مطالعہ میں تہذیب و ثقافت و سیاست پر بظاہر غیر ضروری لیکن واقعتاً نہایت ضروری معلومات نے ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کے متضاد ذائقوں کی لذت کا سامان فراہم کر دیا۔

کتاب کو پروفیسر عین الحسن نے بجا طور پر یگانہ نوعیت کی موازنہ نگاری کا حامل قرار دیا ہے۔

پیش لفظ پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی کے قلم سے ہے، وہ تاریخ و ثقافت کے اعلیٰ استاد رہ چکے ہیں۔ فاضل مؤلف کو بھی ان کی شاگردی کا اعزاز حاصل ہے۔ کربل کتھا پر ان کو لکھنے کا حق بھی تھا کیونکہ وہ یہی مانتے آئے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلافت رسولؐ کے وجود میں آنے کے باوجود قبائلی عصبیتیں ہی شہادت حضرت علیؓ کا سبب بنیں، ان کے الفاظ میں ”بنی امیہ کے ایک فرد معاویہ نے خلافت کا خاتمہ کر کے موروثی ملوکیت کی بنیاد ڈال دی تا کہ اسلام کے عروج و احیاء سے جو نقصان بنی امیہ کو پہنچا تھا اس کا ازالہ ہو سکے“۔ پروفیسر ہمدانی کو یہ عجب لگا کہ امیر معاویہ نے ایران کے شہنشاہ آریہ مہر اور رومی نظام کو اپنا کر ایرانی سیاست کے عربوں پر غلبہ کی راہ ہموار کر دی کہ اس میں شامل مطلق العنانیت کے بغیر امیر معاویہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ خیال کوئی نیا نہیں بلکہ اسے پامال نظریہ ہی کہا جائے گا، لیکن پروفیسر ہمدانی کو بڑا تعجب اس پر ہوا کہ ہندوستان میں تین شیعی ریاستوں گولکنڈہ، بیجاپور اور اودھ نے بھی امیر معاویہ کے سیاسی ڈھانچہ کو اپنایا۔ شاید اسی طرز فکر کی وجہ سے پروفیسر موصوف نے کتاب کے فاضل مصنف کے متوازن انداز کی ستائش کی۔ یہ پیش لفظ اور بھی تحقیقی خوبیوں کی وجہ سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کا سبب ہے۔ سب سے بڑی خوبی بہر حال یہ ہے کہ اس میں مطالعہ کی کثرت و وسعت کا حق ادا کیا گیا ہے، اس سے پہلے سیوانی صاحب کی ایک کتاب تدوین متن کی روایت نے بتایا تھا کہ محنت کیا ہوتی ہے۔ قریب آٹھ نو سو صفحات پر اس کتاب نے اصل مطالعہ کی حیرت انگیز صلاحیت کا نمونہ پیش کر دیا تھا۔ زیر نظر کتاب نے اس حیرت میں اضافہ ہی کیا۔ (عمیر الصدیق ندوی)

غلام مصطفیٰ دائم، معارف کے تقدیسی مطالعات، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۵۷۰، ملنے کا پتہ: درج نہیں، شائع کردہ نعت ریسرچ سینٹر ۳۰۶۔بی، بلاک ۱۴، گلستان جوہر، کراچی، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۵۰۰ روپے، موبائل وای میل: درج نہیں۔

معارف، اعظم گڈھ کو اردو کا دائرۂ معارف اسلامیہ کہا گیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس منفرد رسالے کے سینے بلکہ سفینے میں مقالات کی شکل میں علم و تحقیق اور مختلف اصناف ادب کے سیکڑوں گوہر آبدار محفوظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے معارف پر تحقیقی مطالعات کا دائرۂ التفات وسیع ہوا ہے اور اس پر ہند و پاک میں کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن میں بعض منتظر اشاعت اور بعض منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس میں مرتب نے معارف میں مطبوعہ ان مضامین کے عکس اسکین کرکے چھاپ دیے ہیں جو تقدیسی ادب یعنی حمد، نعت، مناجات اور منقبت سے متعلق تھے۔ اسکیننگ کی مشکلات سے قطع نظر اس سے مرتب کو پروف ریڈنگ کے طول عمل اور مقالات کی اڈیٹنگ کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑی۔ ان کے مطابق یہ معارف میں شائع شدہ اس سلسلے کے جملہ مقالات کے متون کا عکسی اندراج ہے۔ سو سال سے زیادہ عرصے میں معارف میں تقدیسی ادب پر مضامین کی قلت اشاعت کا انہیں شکوہ بھی ہے۔ ان کے بقول شروع سے نومبر ۲۰۲۴ء تک کے دستیاب تیرہ سو شماروں میں تلاش بسیار کے باوجود انہیں معارف میں صرف ۴۳ اندراج ملے، جب کہ فہرست میں ۴۴ اندراجات ہیں۔ محسن کاکوروی اوران کی خصوصیات، نعت قدسی اور اس کا مصنّف، قدسی الٰہ آبادی اور نعت قدسی، اردو کی مناجاتی شاعری کے عنوان سے مضامین دو دو قسطوں میں ہیں۔ قسط وار مضامین کو اگر ایک ہی مضمون مانا جائے تو مضامین کی کل تعداد ۳۹ تک پہنچتی ہے۔ حالانکہ مرتب کی نگاہ تلاش کو مزید تفحص کی ضرورت تھی۔ سردست جو مضامین اس فہرست کو اور بڑھا سکتے تھے ان میں قل العفو (علامہ اقبال کی نظم صدیقؓ قرآن وحدیث کی روشنی میں)، محمد بدیع الزماں، اکتوبر ۱۹۸۷، کالی داس گپتا رضا کے مضمون قدسی الٰہ آبادی اور نعت قدسی مطبوعہ دسمبر ۱۹۹۰ کی تیسری قسط، اردو نعت گوئی کے موضوعات، ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط، مارچ ۱۹۹۲ء، اردو کی حمدیہ شاعری کا جائزہ، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد، مارچ تا مئی ۱۹۹۹ء، اردو نعت نویسی کی روایت میں تاریخی شعور، حافظ محمد بلال اعجاز، مئی ۲۰۱۲ء وغیرہ ہیں۔

پیش لفظ کے مطابق اس تحقیق میں حمدیہ ونعتیہ کے ساتھ منقبتی مطالعات بھی شامل ہیں تاہم ایک مضمون مناقب ذوالنورین، محمد ابواللیث صدیقی، جون ۱۹۴۲ء کی عدم شمولیت پر تعجب ہے۔ اسی طرح سید وحید اشرف کچھوچھوی کے مضمون ”امیر خسرو بحیثیت فارسی رباعی نگار“، فروری ۲۰۱۰ء کو بھی شامل کیا جانا چاہئے تھا جس میں جا بجا ایسی رباعیاں ہیں جن سے تقدیسی مطالعات کی نشاندہی ہوتی ہے اور ان میں حمد و نعت پر مشتمل بہت سی رباعیاں زیر بحث آئی ہیں۔ یہ رباعیاں گرچہ فارسی میں ہیں لیکن ان کی توضیح و تشریح اردو میں کی گئی ہے۔ مرتب نے اندراج نمبر ۳۱ بعنوان ”معارف کی ایک نعت / خط“ کے ”مضمون نویس“ کے کالم میں مکتوب نگار کے سلسلے میں لکھا ہے ”علی گڑھ سے کوئی مکتوب نگار“۔ یہ مکتوب نگار فارسی کے مشہور و معروف عالم اور معارف کے دیرینہ شاعر ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں شامل اکثر مضامین کو بلاشبہ اہل علم وادب کے نزدیک درجۂ اعتبار واستناد حاصل ہے۔ مختصر پیش لفظ میں معارف کی ان فکری وتحقیقی کاوشوں، موجودہ عہد میں ان کی افادیت کے تحقیقی زاویے اور نعت کے تخلیقی وتنقیدی ارتقا کے سلسلے میں ان مضامین کی اہمیت کی جانب محض اشارہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان مضامین کی اہمیت اور اس کی موجودہ معنویت اور قدروقیمت کے تعین پر سیر حاصل گفتگو کی ضرورت تھی۔ کتاب کا بلرب مشہور اہل علم اور معارف کے قدیم مقالہ نگار اور اس کے دل سے قدرداں ڈاکٹر سید یحی نشیط نے لکھا ہے اور معارف کے اس ذخیرے کو گنجینۂ خیر سے تعبیر کیا ہے۔　　　(کلیم صفات اصلاحی)

اشہد رفیق ندوی، دینی مدارس کا نظام ونصاب۔ ایک تجزیاتی مطالعہ، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات، ۱۸۲، ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، سن اشاعت، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۷۲۹۰۰۹۲۴۰۱، ای میل: mmipublishers@gmail.com

صاحب کتاب پیشۂ درس وتدریس سے ایک زمانے سے وابستہ ہیں۔ عصری درسگاہ سے وابستگی کے باوجود دینی مدارس کے تعلیمی وتدریسی اور ان کے تربیتی نظام پر غور وفکر ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایک اچھے اہل قلم ہیں۔ ان کی تحریروں میں بڑی شستگی وبرجستگی اور روانی وسلاست ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب دینی مدارس کے نظام ونصاب سے متعلق ملک کے متعدد قومی وبین الاقوامی سیمیناروں میں مختلف وقتوں میں پیش کیے گئے اور مقتدر رسائل میں شائع کل ۱۳ مقالات کا مجموعہ ہے۔ پہلے مقالے میں دینی مدارس کو جن کو بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ ملک کی فسطائی طاقتوں کی طرف سے نہیں چھوڑا گیا ہے بجا طور پر ملک کا قیمتی اثاثہ بتایا گیا ہے۔ اس سے وطن عزیز میں مدرسوں کی قدروقیمت اور ان کی اہمیت پوری طرح اجاگر ہوئی ہے۔ دوسرے میں مدارس کے نظام ونصاب کا عصر حاضر کے تناظر میں جائزہ لے کر نصاب میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی بات بڑے عقلی اور مدلل انداز میں کی گئی ہے۔ تیسرے میں نظام تربیت پر افادیت بخش اور عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد چند مضامین میں مدارس میں علوم اسلامیہ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی تدریس کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ہندوستان کے ممتاز ونمایاں مدارس دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر وغیرہ میں شامل درسی کتابوں کا چارٹ بھی پیش کر دیا ہے۔ ہندوستان میں مختلف افکار ونظریات کے حامل افراد بودوباش رکھتے ہیں۔ ان مدارس

سے اکثریتی طبقہ کو کس قسم کی امیدیں اور توقعات ہیں؟ ایک مضمون میں اس کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مدارس کے تحفظ وارتقا کی تدبیروں اور مدارس کے ذمہ داروں سے تخاطب کے طریقے کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اعظم گڑھ میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے، مصنّف نے ان کے نصاب ونظام کا جائزہ لے کر چند تجاویز ایسی پیش کی ہیں جن کو بروئے کار لاکر بہت سے جمود کے شکار مدارس کے ماحول میں حرکت پیدا کی جاسکتی ہے۔ کتاب کا سب سے پرکشش پہلو بعض مقامات پر مصنّف کا محاکمہ ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ مدرسوں کے بنیادی مقاصد میں دعوت دین کے لیے افراد تیار کرنا بھی ہے لیکن اس مقصد کے حصول میں ناکامی کے متعلق ان کا یہ تجزیہ صداقت پر مبنی ہے کہ خود نصاب ہی میں بہت کم گنجائش نکالی گئی ہے (ص ۲۵) غالباً اسی وجہ سے مدرسے سے داعی نہیں نکل پارہے ہیں۔

کتاب میں تحقیقی فرائض کی ادائیگی کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ علامہ شبلی نے مدارس کی تنظیم کا قابل عمل نظریہ بہت پہلے پیش کیا تھا مصنّف نے اسی سے متأثر ہو کر مدارس کو وفاقی نظام کے تحت منظم کرنے کا مسئلہ نہ صرف زور وشور سے اٹھایا ہے بلکہ اس کی ضرورت واہمیت اور اس کو کیسے وجود میں لایا جاسکتا ہے اس پر بڑی اہم گزارشات پیش کی ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک مدارس کے draw back کی ایک اہم وجہ مدارس کے وفاقی نظام کا فقدان ہے (ص ۱۷) مصنّف نے مدارس کے نصاب میں اصلاح کے مقصد سے جو سفارشات اور تجویزیں پیش کی ہیں اکثر قابل عمل ہیں لیکن دعوت دین، ہندوستانی تہذیب، مغربی علوم وافکار اور معاصر زبان جیسے موضوعات کو نصاب کا حصہ بنانے کی تجویز ہی کافی نہیں ہے۔ متعلقہ موضوعات پر کتابوں کی نشاندہی بھی ہونی چاہئے تھی۔ اس سے ان تجاویز کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی۔ پہلے مقالے کے آخر میں ص ۲۹ پر جو خلاصۂ کلام درج ہے بالفاظہ وہی آخری مضمون کے اختتام پر ص ۱۷۸ پر بھی درج ہے۔

دینی مدارس پر جس انداز سے حکومت کی تلوار لٹک رہی ہے اور ان کا وجود شہتیر نگاہ بنا ہوا ہے۔ ایسے میں یہ کتاب جدید تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو کر زمانے کے ساتھ چلنے کا عزم پیدا کرنے میں کامیاب اور نظام ونصاب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ اور اس لائق ہے کہ مدارس سے وابستہ باحوصلہ افراد اور ذمہ داران اس سے ضرور استفادہ کریں۔ امید ہے قیمتی اور فکر انگیز معلومات اور دلچسپ اسلوب کے سبب مدارس کے حلقے میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(ک، ص اصلاحی)

ادبیات

نظم

فرشتے لینے آئے ہیں

(ایک فلسطینی بچی کے آخری الفاظ)

خالد ندیم، سرگودھا، پاکستان
dr.khalidnadeem@gmail.com

مِرے بابا!
فرشتے لینے آئے ہیں
بچھا کر اپنے نُورانی پروں کو میرے قدموں میں
درُودِ پاک پڑھتے ہیں
مجھے ان پر بٹھاتے ہیں اور اِک درخواست کرتے ہیں
چلے آؤ
چلے آؤ، ہمارے ساتھ، اے ننھی پری!
اے ننھی پری! تم کو بلاوا آ گیا ہے
مِرے بابا!
ذرا دیکھو.... ذرا دیکھو فلک کی اور
فلک کی اور، لیکن اُس سے بھی آگے
اگر تم دیکھ پاؤ تو وہاں بیری کا پودا ہے
اور اس کے سایے میں گویا شہیدوں کا ٹھکانا ہے
وہیں مجھ کو بھی جانا ہے
مِرے بابا!
مِری ماں اور مِرے بھائی
مِری بہنیں، مِری ہمجولیاں مجھ کو بلاتی ہیں
مِری بستی کے سارے لوگ بھی آواز دیتے ہیں
چلے آؤ، غزہ میں اَب تمھارے واسطے کچھ بھی نہیں باقی
چلے آؤ
کہ ہم سب مل کے اپنے خالق و مالک سے یہ پوچھیں
تِرے محبوبؐ کی اُمت کہاں ہے؟

معارف کی ڈاک

معارف بابت اپریل ۲۰۲۵ء کی ڈاک میں جناب فضل الرحمٰن اصلاحی نے راقم کے ناچیز مضمون 'شبلی شکنی کی روایت' پر جو کچھ ارشادات فرمائے ہیں، مَیں اس پر اُن کا بے حد ممنون ہوں اور مَیں اُن کی تصیحات اور اُن کی تجاویز کو آئندہ کے لیے مشعلِ راہ بنانے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ اُن کی بعض تنقیدی آرا میں بھی بعض سے کُلی اور بعض سے جزوی اختلاف بھی ہے، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اُنھوں نے جس توجہ سے اس تحریر کا مطالعہ کیا اور علامہ شبلی سے اپنی عقیدت و محبت اور اپنے تنقیدی و تاریخی شعور کی روشنی میں جس طرح ایک نقطۂ نظر قائم کیا ہے، وہ فی زمانہ جنسِ کم یاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مَیں ایک مرتبہ پھر اُن کا شکر گزار ہوں، امید ہے کہ آئندہ بھی مجھ ناچیز پر توجہ فرماتے رہیں گے۔

خالد ندیم، سرگودھا، پاکستان

dr.khalidnadeem@gmail.com

فاحش یا فحش

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ رب العالمین آپ سب کو اجر کریم سے نوازتے رہے۔ لاکھوں لاکھ شکر کا مقام ہے کہ ہر دلعزیز "معارف" ہر مہینے نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔

شمارہ اپریل ۲۰۲۵ اور دو گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب، ترکیب "فاحش اغلاط" میں اٹک گئے ہیں اور رسالے کے کئی صفحات کسی پختہ محقق کی "انانیت" پر جارہے ہیں۔ اس کی بجائے، کوئی عالمانہ مضمون آپ چھپوا سکتے تھے۔

"غلط ہائے فاحش" فارسی میں مستعمل ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو فارسی میں مستعمل ہے وہ ہو بہو اردو میں مستعمل ہو۔ اردو میں ہزاروں الفاظ و تراکیب ملتے ہیں جو بظاہر فارسی ہیں لیکن ان کا مفہوم، تلفظ اور ادائیگی فارسی سے بالکل مختلف ہیں۔ "اردو لغات" کا حوالہ دینا بھی بے کار ہے۔ کیوں کہ اس ۲۲ جلدوں والی لغت میں ہزاروں الفاظ و تراکیب ملتے ہیں جو، آجکل منسوخ ہو چکے ہیں۔

براہ کرم مودبانہ گزارش ہے کہ "رسالہ معارف" کے قارئین اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ یہ علمی رسالہ ہے آگاہی کے لیے، کسی کی "انانیت" کی تسکین کے لیے نہیں۔ بصد شکریہ۔

توران رمیزانی

tooranri00@gmail.com

رسید کتب موصولہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، بیان شبلی-۶: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

مولانا محمد الحسنی، تذکرہ سید شاہ علم اللہ حسنی: مکتبہ احسان، لکھنؤ، صفحات: ۱۶۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت: ۱۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۹۳۳۱۲۹۵

ڈاکٹر عبدالرحمٰن ساجد الاعظمی، حیات شیخ الاسلام (امتیازات و خصوصیات): مکتبہ نذیریہ، سرائے پختہ، مرادآباد، صفحات: ۲۷۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۷۰روپے، موبائل نمبر: ۹۰۵۸۰۵۵۶۰۰

ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی، خوشبوئے مدینہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، صفحات: ۱۳۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۰۲۹۴۲۸۳

رافت النساء، نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی (مرتب)، سفر شوق: مکتبہ فرنگی محل، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۰۵۲۰۲۷۹۷

ڈاکٹر عرفات ظفر، شذرات اصلاحی: حرا بک ڈپو، شباب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ، صفحات: ۳۲۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۷۰۰۷۸۹۲۰۰۵

مولانا منور سلطان ندوی، عوامی مقامات پر نماز کا مسئلہ: مکتبہ احسان، نزد شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۳۶۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت اور موبائل نمبر درج نہیں۔

پروفیسر مستنصر میر، ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی (مترجم): قرآن مجید میں نظم: البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۷۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۴

مولانا محمد خالد فیصل ندوی، متاعِ خامۂ دل: جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، ٹیگور مارگ، نزد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۹۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت: ۷۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰

رفیع احمد محمد عاقل مدنی، مولانا عبدالسلام مدنیؒ حیات اور خدمات: مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۸۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

MAY 2025 Vol- 212(05) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

مطالعات شبلی	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
تاریخ اسلام (اول ودوم اور سوم و چہارم)	شاہ معین الدین احمد ندوی	1060/-
تاریخ صقلیہ (اول ودوم)	مولانا سید ریاست علی ندوی	800/-
مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	300/-
مختصر تاریخ ہند	مولانا ابوظفر ندوی	80/-
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی	80/-
مرزا دبیر کی شاعری	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تعلیم - عہد اسلامی کے ہندوستان میں	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
آثار شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-
شبلی کی ادبی وفکری جہات	ڈاکٹر شمس بدایونی	200/-

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-